شیشہ و تیشہ
(شاہد صدیقی کے مزاحیہ کالم)
(مرتبہ)
مجتبیٰ حسین
پبلشر
آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی
کنگل کنٹہ — حیدرآباد — آندھرا پردیش

شیشہ و تیشہ

(شاہد صدیقی کے مزاحیہ کالم)

مرتبہ

مجتبیٰ حسین

پبلشر: آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی
بلگ کنٹہ — حیدرآباد -- آندھرا پردیش

قیمت: ۳ روپے

(مطبوعہ)

انتخاب پریس

جواہر لال نہرو روڈ۔ حیدرآباد۔ آندھرا پردیش

بار اوّل ——— ۵۰۰

اشاعت ——— مارچ ۱۹۶۷ء

فہرست

جب آپ "شیشہ و تیشہ" کے کالموں کا منتخب مجموعہ پڑھیں گے تو اُس جیتے جاگتے زندہ دل شاہد سے ملیں گے جو مرا نہیں۔

شاہد کے بارے میں جگر مراد آبادی نے لکھا ہے کہ "وہ بلا کے ذہین، انتہائی ذکی، نہایت حاضر جواب، بذلہ سنج، لطیف مزاج کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ متین، شریف النفس، مخلص، خوددار، اور حق پسند انسان ہیں"۔

شاہد کی ذہنی دیانت داری، حق گوئی اس کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی "شیشہ و تیشہ" کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہے۔

شاہد کا کمال تو ان کی شاعری ہے، مگر نثر میں اور خاص طور پر طنز نگاری میں اس نے جو تخلیقات چھوڑی ہیں وہ اردو صحافت کے ورثہ کا گراں قدر حصّہ ہیں۔

کوئی کن سے قلم کا نشانہ' ادبی' سماجی' سیاسی' سبھی نوعیت کے مسائل ہیں' ان کی گہرائی چند فقروں اور پاروں تک محدود ہے' مگر جس روانی' صفائی' بے ساختہ پن ذہانت اور اجمال سے وہ اپنا مافی الضمیر ادا کرتا' اور اس سے مضحک اثر پیدا کرتا ہے وہی اصل میں ظرافت نگاری کی جان ہے پھکڑ پن اور شستہ مذاق میں بہت بڑا مگر بہت نازک فرق ہے' جس کا راستہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے' اس راستہ پر کامیابی سے چلنے والے طنز نگار اردو میں کئی ہیں' جن میں سے ایک شاہد صدیقی بھی ہے'

شاہد کی ان تحریروں کو پڑھنے کے بعد دل کی گدگدی ایک شائستہ مسکراہٹ اور ایک مہذب ہنسی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

شاہد کا طنز جانب دارانہ ہے' وہ مجبور کے حق میں جابر کے خلاف' حسن کے حق میں' قبح کے خلاف' ترقی کے حق میں' رجعت کے خلاف ہے۔

شاہد اپنی نظم اور نثر سے ایسی تصویر بناتا ہے کہ تحریر متحرک کارٹون معلوم ہوتی ہے' میں سمجھتا ہوں اس کے طنز کا ہدف بھی چوٹ کا لطف لیے بغیر نہیں رہ سکتا (بشرطیکہ بدذوق نہ ہو) وہ ایک چابکدست کارٹونسٹ کی طرح' اشاروں کنایوں فقروں' لفظوں اور سیدھی سادھی لکیروں سے وہ اثر چھوڑتا ہے جو ہزاروں اداریوں اور تقریروں پر بھاری ہے۔

ہنسی انسان کی فضیلت ہے' اسی لئے کسی مفکر نے انسان کو ہنسنے والا جانور کہا ہے ہنسی دراصل احساس برتری کا ایک اظہار ہے' جو فاتحانہ شان بھی رکھتی ہے' ایک ہنسی ایسی بھی ہوتی ہے' جو احساس کمتری سے پیدا ہوتی ہے' جو کھسیانی ہنسی کہلاتی ہے' اور کھمبے نچواتی ہے "شیشہ و تیشہ" سے پیدا ہونے والی ہنسی انسان کی فتح و کامرانی
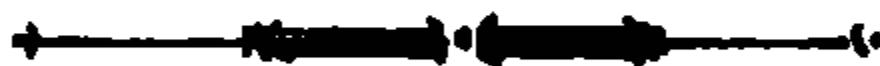
کی ہنسی ہے، جو زندگی بخش اور جاں فزا ہے۔

یہ اچھا ہوا کہ آندھرا پردیش کی ساہتیہ اکاڈمی نے یہ مجموعہ شائع کیا۔
مجھے اس کا قوی اندیشہ ہے کہ "چراغ منزل" سے زیادہ "مقبول" اور "مشہور" ہوگا
چلو، شاہد کے مرنے سے ایک فائدہ یہ تو ہوا کہ اردو ادب پر اس کے احسانات کا
لوگوں پر انکشاف ہو رہا ہے۔

۱۴ر مارچ ۱۹۶۲ء

ایم ایل ایز کوارٹرس حیدرآباد

مخدوم محی الدین

عرضِ مرتّب

اردو صحافت میں طنز و ظرافت سے کالم کی روایت کچھ زیادہ پرانی نہیں ہے بلکہ اب اگر اردو صحافت کے ممتاز کالم نگاروں کی فہرست مرتب کی جائے تو یہ فہرست دس بارہ ناموں سے آگے نہ بڑھ سکے گی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس مختصر سے عرصہ میں "ظریفانہ کالم نگاری" نے اردو صحافت میں نہایت بلند مقام حاصل کر لیا ہے اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہمیشہ نامور ادیبوں اور صحافیوں نے ہی کالم نگاری کے فرائض انجام دئیے ہیں۔

اب یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی کہ شاہد صدیقی مرحوم کوہکن کے قلمی نام سے روزنامہ "سیاست" کا ظریفانہ کالم "شیشہ و تیشہ" لکھا کرتے تھے۔ وہ تقریباً چھ سال تک یہ کالم لکھتے رہے اور اس دوران میں علمی و ادبی حلقوں میں ان کے کالموں نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔

جن اصحاب کو شاہد صدیقی مرحوم کی صحبتوں میں رہنے کا موقع ملا ہے وہ اس بات سے واقف ہیں کہ شاہد مرحوم کی شخصیت کے دو نمایاں اور متضاد پہلو تھے۔ ایک پہلو فکر اور متانت کا تھا جس کا پرتو ان کی شاعری میں جھلکتا ہے۔ اور دوسرا پہلو بذلہ سنجی، ظرافت، حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی کا جس کی جھلکیاں ان کے ظریفانہ کالموں میں نظر آتی ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ شاہد کی شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں میں کونسا پہلو زیادہ جاندار اور تخلیقی تھا۔ اور یہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ خود شاہد مرحوم نے کبھی اپنی شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں کا امتزاج کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے مزاج میں بلا کی بے ساختگی اور بے ریائی موجود ہے۔

شاہد فطرتاً بڑے بذلہ سنج واقع ہوئے تھے کسی محفل میں بیٹھتے تو اسے اپنے تبصروں اور چٹکلوں سے زعفران زار بنا دیتے۔ اور اُن کی اسی فطری ذہانت نے اُن کے کالموں میں بڑی روانی اور شگفتگی پیدا کر دی تھی، شاہد مرحوم کی کالم نگاری کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ شاہد نے اپنے طنز کو ہمیشہ شائستگی کے دائرہ میں محدود اور مزاح کو ہمیشہ کثافت سے دور رکھا۔ بعض مسائل تو ایسے بھی ہوتے جن کے خلاف اُن کے جذبات نہایت شدید ہوتے لیکن جب بھی انہوں نے ان مسائل کو اپنے کالم میں طنز کا نشانہ بنایا تو شائستگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اور شاہد کے کالم کی یہی وہ نمایاں خصوصیت ہے جو اُنھیں دیگر کالم نگاروں سے ممیز کرتی ہے، اُنھوں نے اپنے کالموں کے ذریعہ ہمیشہ رجعت پرستی اور قدامت پسندی کی مذمت کی۔ سماج میں جب بھی اُنھیں کوئی غیر صحت مند علامت نظر آئی تو انہوں نے اس پر بھرپور طنز کیا۔ کالم نگار کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ سماج کو اس کی خرابیوں اور خامیوں سے آگاہ کرے اور اسے مستقبل کے اندیشوں سے خبردار کرے۔ شاہد نے ایک کالم نگار کی حیثیت سے اُن فرائض کو حسن و خوبی کے ساتھ پورا کیا۔ انہوں نے خالص مزاح کی تخلیق کے نام پر بھی "مقصدیت" سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔

اُن کی تحریر میں بلا کی روانی تھی وہ بڑی پاکیزہ اور شستہ زبان لکھتے تھے، جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے وہ کسی خاص اہتمام کے قائل نہ تھے۔ بس ایک بار لکھنے بیٹھ جاتے تو پھر نصف گھنٹہ میں ہی کالم مکمل کر لیتے۔ تحریر میں اس قدر رچاؤ اور نظم و ضبط ہوتا کہ کبھی انہوں نے کالم لکھنے کے بعد مسودہ میں تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ کالم کے لئے موضوع کا انتخاب بھی اُن کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کیونکہ اُن کے سامنے بے شمار موضوعات تھے، جن پر وہ پوری قدرت اور بے باکی کے ساتھ تبصرہ کر سکتے تھے، اُن کے کالموں کو پڑھتے ہوئے کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ کالم نگار نے کہیں تصنع یا بناوٹ سے کام لیا ہو یا پھر طنز اور مزاح کی کیفیت میں جھول پیدا ہوا ہو۔

شاہد کے کالم کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی پیروڈیاں اور مزاحیہ نظمیں تھیں، جو

عوام میں بے حد مقبول تھیں۔ ان نظموں کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ
جب بھی اُن کی کوئی مزاحیہ نظم چھپتی تو اُسے ہندستان اور پاکستان کے اکثر بیشتر اخبارات نقل
کرتے۔ ابتدا میں تو وہ صرف نثر میں ہی کالم لکھتے رہے لیکن اپنی کالم نگاری کے آخری دو برسوں میں
انہوں نے مزاحیہ نظمیں لکھنے کی جانب توجہ کی جو ہر اتوار کو پابندی سے شایع ہوا کرتی تھیں۔
انھیں زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل تھی اور وہ مزاح کے نازک ترین احساس کو بھی
اس کی صحیح کیفیت کے ساتھ قاری تک پہونچا سکتے تھے مزاحیہ نظموں میں شاہد کی ظرافت اور
بذلہ سنجی اپنے انتہائے عروج پر نظر آتی ہے۔ وہ اپنی ان نظموں کے درمیان اکثر اوقات مشاہیر
شعراء کے اشعار کا کچھ اسطرح تصرف کرتے کہ سنجیدہ اشعار میں بھی بے پناہ ظرافت کا پہلو
نکل آتا تھا۔ مثال کے طور پر ایک نظم میں برتھ کنٹرول" کا تذکرہ ہو رہا ہے اور کوئی صاحب
اپنی کثیر العیالی کا شکوہ کر رہے ہیں کہ نظم میں اچانک یہ شعر آ جاتا ہے۔

؎ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد ——— اب ظاہر ہے کہ اس کے
بعد اس شعر کے اصل معنیٰ و مطالب بدل کر رہ جاتے ہیں۔ شاہد مرحوم نے جگہ جگہ ایسے کئی برمحل
اور برجستہ اشعار استعمال کئے ہیں جن سے مزاح کا رنگ دوبالا ہو گیا ہے۔ یہاں یہ بات
قابلِ ذکر ہے کہ ہندستان اور پاکستان کے اخبارات میں جتنے بھی ظریفانہ کالم شائع ہوتے
ہیں وہ سب کے سب نثر میں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ شاہد کا ہی حصہ تھا کہ وہ ہر اتوار کو نہایت
پابندی سے ایک طویل مزاحیہ نظم لکھ دیتے تھے۔

آخر میں شاہد کے کالموں کے انتخاب کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا ضروری ہے
شاہد نے چھ سال کے عرصہ میں بے شمار موضوعات پر کالم لکھے جن میں سے کچھ موضوعات تو
بالکلیہ عبوری اور وقتی نوعیت کے ہیں لیکن اکثر موضوعات ایسے بھی ہیں جن کی اہمیت کسی
مخصوص وقت کے تابع نہیں رہ سکتی۔ شاہد کے پاس ہمیشہ زندہ رہنے والے کالموں
کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اور ایسے کالموں کی فراوانی نے ہی انتخاب کے کام کو کسی قدر مشکل بنا دیا تھا۔

اس مجموعہ میں شاہد کے ایسے کالموں کا انتخاب کیا گیا ہے جو اُن کے مخصوص مزاج کے آئینہ دار ہیں، سہولت کی خاطر ان کالموں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ یعنے ادبی، سماجی، سیاسی، اور نظمیں ۔

غالباً یہ پہلا موقع ہے جب کہ اردو کے ایک ممتاز کالم نگار کے کالموں کا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے ۔ اور اس کا سہرا ساہتیہ اکیڈیمی آندھرا پردیش کے سر ہے ۔ جس نے شاہد صدیقی کے انتقال کے فوراً بعد اس مجموعہ کی اشاعت کا فیصلہ کیا تھا ۔ ساہتیہ اکیڈیمی کا یہ اقدام یقیناً لائق تحسین و ستائش ہے کہ اس طرح شاہد کی مزاح نگاری کے وہ نمونے محفوظ ہو گئے ہیں جو ظاہر ہے کہ چند دنوں کے بعد بھلا دیئے جا سکتے تھے ۔ مجھے یقین ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں اس انتخاب کو پسند کیا جائے گا ۔ اور اس میں شبہ کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے کیونکہ شاہد کے یہ کالم روزنامہ سیاست کے قارئین سے بہت پہلے ہی دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں ۔

میں جناب عابد علی خاں صاحب ایڈیٹر "سیاست" کا ممنون ہوں کہ انہوں نے ان کالموں کے انتخاب کے بارے میں میری رہنمائی فرمائی اور گرانقدر مشوروں سے نوازا میں محترمہ طاہرہ شاہد صدیقی کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے اخبارات کی فائیلوں سے شاہد مرحوم کے کئی کالم نقل کئے اور اس طرح میرے کام کو بہت آسان بنا دیا ۔

یکم مارچ ۱۹۶۲ء
حیدرآباد ۔

مجتبیٰ حسین

ادبی

○

خبر آئی ہے اور کیا ہی سنسنی خیز آئی ہے کہ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے شراب نوشی ترک کر دی ہے اور جس وقت یہ سطریں آپ کے مطالعہ میں آئیں گی اس وقت تک ان کے "ترکِ مے" کو کم و بیش دو ہفتے گذر چکے ہوں گے، جو لوگ جوش صاحب سے ذاتی طور پر واقف ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ شراب موصوف کی زندگی کا ایک جزو۔ بلکہ جزوِ اعظم بن چکی تھی۔ آپ روزآنہ پیتے تھے۔ یہاں تک کہ جوش اور شراب کا رشتہ بہت گہرا ہو چکا تھا اور بڑے سے بڑے اہل نظر کے لئے یہ کہنا مشکل تھا کہ شراب کہاں ختم ہوتی ہے اور جوش ملیح آبادی صاحب کہاں سے شروع ہوتے ہیں گویا بالکل ــــــــــــــ

من تو شدم تو من شدی والا معاملہ تھا۔ اور اب جبکہ موصوف سرخیل رنداں کے عہدے پر نہیں ہیں بلکہ گروہِ متقیاں میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔

ہم جیسے آدمی کے لئے سوچنا ضروری ہے کہ آپ نے بہ درستی ہوش و حواس و بہ سلامتیٔ عقل شراب کو چھوڑا ہے یا خود شراب نے آپ کو طلاق ... دیدی ہے۔ پاکستان میں شراب پر بھاری ٹیکس لگا ہوا ہے۔ چنانچہ "دخت رز" کا بھاؤ بہت بڑھ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جوش صاحب مستقبل سے کچھ امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہوں یعنی اس مجبوری کے دور کو تشنگی کے

عالم میں گذار دینا چاہتے ہوں اور جیسے ہی بازار میں شراب کا بھاؤ گرے آپ پھر جام بدست نظر آنے لگیں۔!

اور ہم لگے ہاتھوں یہ بھی سوچ رہے ہیں کہ اب جوش صاحب کی اس شاعری کا کیا حشر ہوگا جسے شراب سے توانائی ملتی تھی۔ اور جو کباب سے قوت حاصل کرتی رہتی تھی؟!!

۲۶ر اگست ۱۹۵۹ء

○

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "فری اسٹائل" کی اصطلاح صرف پہلوانوں کی کشتیوں تک محدود ہے، وہ سخت غلطی پر ہیں اور ہمیں ان کا مستقبل خطرے میں نظر آرہا ہے حقیقت یہ ہے کہ آج کل کی دنیا میں فری اسٹائل، رواج عام کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور یہ اصطلاح زندگی کے بے شمار شعبوں میں اسی طرح استعمال کی جا سکتی ہے۔ جس طرح کشتیوں اور اکھاڑوں کے سلسلے میں استعمال کی جاتی ہے۔

ہندستان میں جب سے (FREEDOM یعنی آزادی) نے قدم رنجہ فرمایا ہے، لوگ جوق در جوق فری اسٹائل ہوتے جا رہے ہیں اور آج صورت حال یہ ہے کہ ادب اور شاعری سے لیکر مصوری، موسیقی تک کوئی فن ایسا نہیں ہے جس میں فری اسٹائل کے بہترین نمونے نہ ملتے ہوں!

مثال کے طور پر ہمارے ایک دوست ہیں جو شاعری میں دور دور تک اپنا جواب نہیں رکھتے اور جہاں تک مصرعہ پر مصرعہ لگانے کا تعلق ہے ساری دنیا میں آپ کا کوئی حریف نہیں۔ ایک دن آپ انتہائی موڈ میں تھے اور ہم زندگی سے بیزار ہو چکے تھے، موصوف نے ہمیں اپنا یہ مطلع سنایا۔۔

شمع محفل میں جلا کرتی ہے پروانے کے ساتھ
مگر صحرا میں کوئی نہیں رہتا دیوانے کے ساتھ

ہم نے بعد ادب عرض کیا کہ دوسرا مصرعہ بحر سے بالکل ہی خارج ہے " بس پر پینترا بدل کر فرمانے لگے جی ہاں دوسرا مصرعہ فری اسٹائل میں چلا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ ہم لاجواب ہو گئے ۔

موسیقی میں بھی فری اسٹائل کا عمل دخل بڑھتا جا رہا ہے اور اس فن سے تعلق رکھنے والے جن لوگوں کی انگلیاں زمانے کی نبض پر رکھی ہوئی ہیں وہ " لے " اور سر کے مطابق گانا رجعت پسندی سے تعبیر کرنے لگے ہیں ۔ اور کہیں کہیں تو یہ عالم پیدا ہونے لگا ہے کہ اگر کوئی قدیم مکتب خیال کا پیرو قاعدے کے تحت گانے بجانے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر انگلیاں اٹھتی ہیں بلکہ پولیس کی نظریں بھی اٹھتی ہیں ۔

یہ صورت حال بھی موسیقی میں فری اسٹائل کے اثر و نفوذ کا نتیجہ ہے !

اور مصوری میں فری اسٹائل کے نمونے تو خود آپ نے بھی دیکھے ہوں گے ہمارا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ایسی تصویریں ضرور دیکھی ہونگی جنھیں دیکھنے کے بعد آپ کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئی ہونگی اور آپ نے بے اختیار سوچا ہو گا کہ ؎

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

تصویریں اس لئے بنائی جاتی ہیں کہ دیکھنے والے انھیں سمجھیں اور ان سے متاثر ہوں لیکن فری اسٹائل کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ آپ اسلوب کے مطابق بنی ہوئی ایک ہزار تصویریں دیکھ جائیے لیکن ایک تصویر کا مفہوم بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا متاثر ہونا بہت دور کی بات ہے ۔

جب سے مصوری کے فن لطیف پر فری اسٹائل کا سایہ پڑا ہے عجب طوائف الملوکی پھیل گئی ہے ایک صاحب کاغذ پر چند لکیریں کھینچ دیتے ہیں پس منظر میں شیر کا چہرہ بنا دیتے ہیں اور اس تصویر کا نام رکھتے ہیں " حسن غمگین " ۔ ایک صاحب چپل سینڈل کے اوپر آفتاب کو طلوع ہوتا ہوا دکھاتے ہیں اور تصویر کا عنوان ہوتا ہے " شب انتظار " ہم نے

خود ایک ایسی تصویر دیکھی ہے۔ جس میں ایک سمندری جہاز طوفان کے حوالے ہو رہا تھا۔ سطح آب پر ایک وھیل مچھلی کی دم نظر آرہی تھی اور تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا "کوے جانا" چنانچہ یہ تصویر دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے۔

بہرحال یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ فری اسٹائل کی اصطلاح صرف اکھاڑے تک محدود ہے۔

اگر دیدۂ بینا سے کام لیا جائے تو زندگی کے ہر موڑ پر فری اسٹائل کا ایک نمونہ مل سکتا ہے۔

۳۱ اگست ۱۹۵۹ء

○

فصیح الملک مرزا داغ دہلوی مرحوم کا ایک لطیفہ مشہور ہے کسی صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ آپ شعر کس طرح کہتے ہیں انہوں نے جواب دیا "جب مجھ پر شعر گوئی کا عالم (MOOD) طاری ہوتا ہے تو میں شعر کہنا شروع کر دیتا ہوں" یہ سن کر وہ صاحب بہت حیران ہوئے۔ اور چونکہ خود بھی شاعر تھے اس لئے اپنا طریقۂ شعر گوئی یوں بیان کیا کہ میں تو شعر کہتے وقت بستر پر لیٹ جاتا ہوں کروٹیں بدلتا ہوں ہاتھ پاؤں پٹکتا ہوں تب کہیں جا کر غزل ہوتی ہے۔ داغ صاحب نے فرمایا یہ شعر کہنا نہیں بلکہ شعر جننا ہے۔

ہمارے علم میں بھی ایک صاحب ایسے ہیں جو شعر گوئی کے وقت بڑے کرب و اذیت سے دوچار ہوتے ہیں منہ بناتے ہیں ہوا میں ہاتھوں کو حرکت دیتے ہیں زانو پر دوہتڑ مارتے ہیں لال لال آنکھوں سے خلا میں گھورتے ہیں۔ تب کہیں انھیں ایک مصرعۂ تر کی صورت نظر آتی ہے۔

ایک اور صاحب جو خاصے قوی الجثہ ہیں اور بسیار خور رہونے کے باوجود

اپنے آپ کو شاعر کہتے ہیں، شعر کہنے کے دوران میں زور زور سے سانس لیتے ہیں، پیٹ کو پھلاتے ہیں۔ آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور یوں فکر سخن فرماتے ہیں۔ ایک صاحب "دائم المنوم" ہیں یعنی اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ سونے میں گذارتے ہیں، جب آپ دیکھیں کہ موصوف کسی کرسی پر یا آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے یا لیٹے ہوئے خراٹے لینے میں مصروف ہیں تو یقین کر لیجئے کہ موصوف شعر کہہ رہے ہیں۔ ایسے عالم میں آپ زیادہ تر مسدس کہتے ہیں، کبھی کبھی غزل سے بھی شوق فرماتے ہیں۔ لیکن با معنی شعر کہنے کی ذمہ داری کبھی قبول نہیں کرتے۔

ایک اور بزرگ جب مشاعرے کے لئے غزل کہنا چاہتے ہیں تو مچھلی کے شکار کی تیاری کرتے ہیں، پھر آپ جتنی مچھلیاں پکڑیں۔ اتنے ہی اشعار کی غزل تیار ہو جاتی ہے، چنانچہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ آپ مشاعرے میں ایک شعر پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس سے سامعین کو بڑی مسرت ہوتی ہے۔

اب سے کچھ دن پہلے یعنی رند۔ صبا وغیرہ کے زمانے تک حقہ شعر گوئی کا ایک جزو لازم تھا اور اکثر اساتذہ سخن بغیر حقہ کے فکر شعر کر ہی نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک استاد نے اپنے ملازم سے حقہ بھروایا اور کش لیتے ہوئے شعر فرمانے لگے۔ شاعروں کی بیخودی کو سب ہی جانتے ہیں، موصوف پر جب غنودگی طاری ہوئی تو آپ کا ایک ہاتھ چلم سے ٹکرا گیا۔ نتیجہ میں آگ لگ گئی اور آپ کا دو غزلہ بھی خاکستر ہو گیا۔ شعر گوئی کے علاوہ شعر خوانی کے وقت بعض شاعروں پر خاص عالم طاری ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر یہاں حضرت نوح ناروی کے شاگرد رشید جناب بسمل الہ آبادی کی ایک سرگزشت دہرائی جاتی ہے۔ یعنی آپ نے کسی اچھے شعر سے خوش ہو کر اپنے منہ کی طرف جو ہاتھ بڑھایا تو وہ ذرا زور سے پڑ گیا اور آپ کے دو دانت ٹوٹ گئے۔

۲۹ ر اکتوبر ۱۹۵۹ء

○

شاعروں کو خطابات تقسیم کرنے کا جو سلسلہ جاگیرداری عہد میں پایا جاتا تھا وہ

اس جمہوری دور میں بھی باقی ہے، ایک حیثیت سے اس طریقہ کی ستائش ہونی چاہیئے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ شاعروں کو اور خاص کر اردو زبان کے شاعروں کو زندگی کی دوسری مسرتیں بہت کم نصیب ہوتی ہیں، اس لئے اگر انھیں ایک آدھ چلتا سا خطاب دیدیا جائے تو کوئی عیب کی بات نہیں بلکہ بہت بڑا ثواب ہے۔

گذشتہ دنوں منڈی میر عالم میں جہاں آلو، میتھی، بیگن پالک اور مرچی ٹماٹر وغیرہ فروخت ہوتے ہیں۔ ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوئی اور صدارت کے لئے جن صاحب کا انتخاب ہوا انھیں شاعر دوربین کا خطاب دیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک شاعر کو دوربین بنا دینا خطاب دینے والوں کے حد سے بڑھے ہوئے مذاق سلیم کا پتہ دیتا ہے، اور ایسے خطابات پڑھ کر اردو کا مستقبل نہایت شاندار نظر آتا ہے۔ اس خطاب کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ اور خطابات بھی تراشے جاسکتے ہیں تاکہ آئندہ وقت ضرورت کام آئیں، مثلاً جب ایک صاحب شاعر دوربین بن چکے ہیں تو کسی دوسرے صاحب کو "دلنشین" کے خطاب سے نوازا جاسکتا ہے اگر کسی شاعر کے کلام میں سختی و درشتی ہو تو اسے "شاعر مرچی" کہنے میں بھی کوئی ہرج نہیں، اسی طرح جس شاعر کی شاعری گرمی و حرارت رکھتی ہو، اسے شاعر آہ آتشیں کہہ کر مخاطب کیا جاسکتا ہے!

ہمارے علم میں ایک ایسے شاعر صاحب بھی ہیں جن کے لئے "شاعر چناں و چنیں" کا خطاب انتہائی موزوں رہے گا۔ اگر وہ قبول کریں!!!

۴ نومبر ۱۹۵۹ء

○

پتہ نہیں مشہور لوگوں سے آٹوگراف لینے کا طریقہ کس شخص نے ایجاد کیا ہے۔ وہ خواہ کوئی بھی ہو، اور کہیں کا باشندہ ہو ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی روح پر اپنی رحمتیں نازل کرے، اس لئے کہ وہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ایک ایسا مشغلہ نکال کر اللہ کو

پیارا ہوا ہے کہ سب اسے رہتی دنیا تک پیار سے یاد کریں گے۔

ابھی حال ہی میں ہمارے یہاں کل ہند مشاعرہ ہوا اور پھر اس مشاعرے کے بعد اہل ذوق نے شاعروں کا جو محاصرہ کیا ہے تو بس لطف ہی آ گیا۔ منظر یہ تھا کہ ایک دیوار کے قریب مجروح سلطان پوری سو آدمیوں کے نرغے میں پھنسے ہوئے "کارواں سحر" کا انتظار کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف ساحر لدھیانوی سینڈوچ بنے ہوئے ہجوم سے باہر نکلنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ جاں نثار اختر پر ایک گھڑی وہ بھی آئی کہ آٹوگراف دیتے وقت شائقین کے ناخنوں کی خراشیں ان کے ہاتھ پر پڑیں اور وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر سکے۔ ایک گوشے میں یہ صورت حال دیکھی گئی کہ اختر الایمان انسانوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں اور راہ فرار نہیں ملتی۔ سردار جعفری بالکل عوامی شاعر و ادیب ہیں لیکن اس مرتبہ عوام کے حملے سے وہ بھی چکرا گئے اور شاید آئندہ آٹوگراف نہ دینے کی قسم کھانے والے ہیں!

آٹوگراف کے سلسلے میں ایک دوست نے بڑا دلچسپ لطیفہ سنایا کہیں مشاعرہ ہوا اور اس کے بعد آٹوگراف لینے اور دینے کا سلسلہ شروع ہو گیا جن لوگوں کے پاس بیاض اور کاپیاں نہیں تھیں وہ کاغذ کے ٹکڑے لیکر آگے بڑھے اور شاعروں سے دستخط لینے لگے۔ اسی دوران میں ایک شخص نے کسی شاعر سے ایک کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھوایا اور مجمع سے باہر جا کر اپنے دوست سے پوچھنے لگا کہ اب میں اس کاغذ کا کیا کروں ۔ عبرت کا مقام یہ ہے کہ اس شخص کو آٹوگراف کا مصرف ہی معلوم نہ تھا اور نہ معلوم ہمارے دیس میں ایسے کتنے نوجوان ہیں جنھیں آٹوگراف کے مقصد کا قطعی علم نہیں اور وہ ایسے موقع پر ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر سب کو نیک توفیق عطا کرے!!!

۱۱ نومبر ۱۹۵۹ء

چند روز پہلے مشاعروں میں شعرا کے انداز شعر خوانی کا ذکر کیا گیا تھا اور قارئین کو یاد دلایا گیا تھا کہ حضرت نوح ناروی کے شاگرد رشید حضرت بسمل الہ آبادی نے ایک مشاعرے میں غزل سناتے سناتے اپنے دانت توڑ لیے تھے، آج اس سلسلے میں ایک اور شاعر صاحب یاد آگئے، جو ذرہ کانپوری کی حیثیت سے مشہور تھے۔ آپ بڑے خاص انداز سے شعر پڑھتے تھے یعنی شعر خوانی کے وقت اداکاری کے ذریعہ مصوری کرتے تھے اور شعر کے مفہوم کو حرکات کے وسیلہ سے بھی سامعین تک پہونچاتے تھے۔

مثلاً اگر آپ کے شعر میں قتل کا مضمون بندھا ہے تو آپ زمین پر ایک گھٹنا ٹیک کر بیٹھ جاتے تھے اور ایک ہاتھ کو اس طرح حرکت دیتے تھے گویا کسی کو تلوار سے ذبح کر رہے ہیں۔ ایک مرتبہ مین پوری میں مشاعرہ ہو رہا تھا، ذرہ صاحب غزل سنا رہے تھے، ڈائس کے بالکل سامنے دوسرے شعرا تشریف فرما تھے۔ جن میں بیدم شاہ وارثی مرحوم بھی تھے، آفات ارضی و سماوی کا انسداد بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے، چنانچہ اتفاق سے ذرہ صاحب کے کسی شعر میں خزاں کا ذکر آگیا آپ نے جوش کے عالم میں ڈائس پر رکھے ہوئے گملوں (کونڈوں) میں سے ایک کو اٹھا کر نیچے پھینک دیا جن میں سے ایک بیدم صاحب کی پنڈلی پر پڑا ایک چیخ بلند ہوئی اور سارے مشاعرے میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور کوئی سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو لیکن ہمارے بیدم صاحب بالکل سمجھ گئے کہ شاعری کی لائی ہوئی خزاں کیا معنی رکھتی ہے!

آگرہ میں ایک استاد وزیر تھے جن کی حس سماعت بالکل ختم ہو چکی تھی لہذا الفاظ اور آواز کے ذریعہ سے ان کے شعر کی داد دینا قطعی ناممکن تھا۔ یار دوستوں نے اس مشکل کو اس طرح حل کیا کہ جب استاد کے شعر کی داد منظور ہوتی ہاتھ بلند کر دیتے، استاد اس بلند ہاتھ کو مصافحہ کا ہاتھ سمجھ کر اپنی جگہ چھوڑ دیتے اور مصافحہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے،

عین غزل خوانی کے وقت استاد کی یہ ٹھک ٹھک بیشک بڑا لطف پیدا کر دیتی تھی شعر خوانی کے لاجواب انداز کی ایک مثال مقامی مشاعرے میں دیکھی گئی کوئی نوجوان شاعر جو شاید زیادہ پی گئے تھے، مائیکروفون کے قریب آئے

مخمور آنکھوں سے سامعین پر نظر ڈالی اور آواز پر قابو پاکر فرمایا میری نظم کا عنوان ہے .... لیکن حلق سے عنوان کی بجائے "واخ" کی صدا نکلی اور سامعین جو نظم کے منتظر تھے بہت بےمزہ ہوئے! شعر کہنے کی طرح شعر پڑھنا بھی آرٹ ہے بلکہ آج کل تو شعر کہنے کے مقابلے میں شعر پڑھنا زیادہ بڑا اور زیادہ پسندیدہ آرٹ بن گیا۔

۳ ستمبر ۱۹۵۹ء

○

ہمارے ملک کی راجدھانی دہلی میں آج کل ملاوٹ کے خلاف ایک مہم چل رہی ہے چنانچہ حال ہی میں ایک شخص کو گرفتار کیا گیا جو چائے میں ملانے کے لئے چنے اور مسور کا چھلکا تھیلوں میں بھر کر لے جا رہا تھا۔!

ملاوٹ کے خلاف مہم چلانا یقیناً ایک بہت بڑا کارِ ثواب ہے تاکہ لوگوں کو خالص چیزیں مل سکیں۔ لیکن اس سلسلے میں مشکل یہ ہے کہ جب سے ہمارے یہاں مصنوعات ملکی کو عام کرنے کا جذبہ پیدا ہوا ہے ملاوٹ زندگی کا جزو بن کر رہ گئی ہے۔ کسی چیز کو دوسری چیز میں ملا کر ایک تیسری چیز کی تخلیق کر دینا بھی بلاشبہ صنعت میں شامل ہے۔ اسی لئے جب صنعت کار حضرات مونگ پھلی کے تیل کو بنولے کے تیل میں ملاتے ہیں تو گھی ہاتھ آتا ہے، اور جب ایک خاص قسم کے پوڈر پر پانی چھڑک دیا جاتا ہے تو دودھ بن جاتا ہے یہاں تک کہ آج کل تو لکڑی کے سفوف کو آٹے کی شکل دے دی جاتی ہے جس کے پراٹھے بڑے شوق سے پکائے جاتے ہیں! پھر لطف یہ کہ "ملاوٹ کا" محل صرف اشیائے خوردنی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے، یعنی اگر آپ خوردبین سے

دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ ہمارے یہاں شعر و ادب میں بھی ملاوٹ پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ ایک مصرعہ غالب کا اور دوسرا مصرعہ مومن کا لیکر مطلع آفتاب بنا ڈالتے ہیں اور سامعین ششدر رہ جاتے ہیں۔

افسانوں میں بھی یہ بات آپ کو ملے گی کہ پلاٹ ہے کسی یورپی مصنف کا اور زبان ہے اپنی' چلئے ایک شاندار افسانہ تیار ہو گیا اور کسی رسالے میں چھپ کر ہدیۂ قارئین ہوا۔

تو گستاخی معاف عرض کرنا صرف یہ ہے کہ ملاوٹ کے خلاف مہم ضرور چلائیے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ہماری زندگی میں جو ملاوٹ پیدا ہو گئی ہے اس کی جڑیں کتنی گہری ہیں!!

۲۷ر نومبر ۱۹۵۹ء

○

چند دن پہلے کرطپہ میں مشاعرہ ہوا تھا اور ایک مقامی خبر رساں ایجنسی کے الفاظ میں بعض شعراء نے قوالی کے طور پر اپنا کلام سنایا!

ہم اِن شعراء کو ستائش و مبارک باد کا مستحق سمجھتے ہیں' جنھوں نے شعر خوانی کے سلسلہ میں لکیر کا فقیر بنے رہنے کے بجائے جدت و ندرت کی طرف قدم بڑھایا اور قوالی کی طرز پر کلام سنا کر یہ ثابت کر دکھایا کہ شعراء بھی کافی ذہین و فطین ہوتے ہیں!

مشاعروں میں شعر پڑھنے کے دو طریقے اِس وقت رائج ہیں' تحت اللفظ یا ترنم سے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کوئی ندرت پسند اور جدت نواز ذہین شاعران فرسودہ طریقوں پر قانع نہیں ہو سکتا کائنات میں ارتقاء کا عمل جاری ہے اور زندگی کے نشو و نما کو روکنا ممکن نہیں۔ اِس لئے کیا عجب ۔ کہ اگر آج کچھ شاعر قوالی کے انداز میں شعر سنا سکتے ہیں تو کل بعض شعراء مشاعروں کو پکے گانے کے لئے استعمال کرنے لگیں۔ اور ہمارے مشاعرے بھیرویں' بھیم پلاسی' مانڈ' دل اور ملتانی کے سروں سے گونج اٹھیں۔

چونکہ پکا گانا بغیر طبلہ اور تمبورے کے ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔ اس لیئے مستقبل کے منتظمین مشاعرہ کو دوسری چیزوں کے علاوہ ان سازوں کا انتظام بھی کرنا پڑے گا اس طرح سے مشاعروں کا لطف یقیناً دوبالا ہوجائے گا۔ ذرا تصور تو فرمایئے ایک طرف تمبورہ چھڑا ہوا ہے دوسری طرف طبلے پر تھاپ پڑ رہی ہے اور شاعر صاحب اپنی تازہ غزل جے جے ونتی میں بٹھا کر ارشاد فرما رہے ہیں ؎

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہیں گے
تہہ خاک ہم تو اکیلے رہیں گے

۲ر ڈسمبر ۱۹۵۹ء

○

زندگی تجربات سے بنتی ہے، اسی طرح شاعری بھی تجربات سے سنورتی ہے، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آجکل ہماری شاعری میں تجربات کا ایک طوفان آیا ہوا ہے، اور شاعروں کی اکثریت اپنی زبان کی شاعری کو نئی نئی نظموں سے زیادہ باوقار بنانے پر مائل ہے۔

اس سلسلہ میں ایک شاعر صاحب نے اپنی جدتِ فکر کے ذریعہ یہ نمونہ تراشا ہے ؎

زندگی کس کے لئے ہے
بیخودی کس کے لئے ہے
آدمی کس کے لئے ہے
سرخوشی کس کے لئے ہے
بھاگ جا رے، ہم نشیں

ایک اور صاحب کے تجربہ کا نچوڑ ملاحظہ ہو ؎

آدمی
آدمی زندگی

زندگی مگر ہی، رہزنی

رہزنی، بے دلی، بے خودی، کم سنی

آشتی

دوستی

یا خدا اب میں جاؤں کہاں ؟

یہ سوال اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ شاعر اس وقت کہاں جائے لیکن فی الحال ہم ان نظموں کی معنوی حیثیت پر غور نہیں کر رہے ہیں۔

صرف لفظی ہیئت ہمارے پیش نظر ہے اس لئے ایک تیسرا تجربہ ملاحظہ ہو ؎

آسماں پر چھا رہی تھیں بدلیاں کل رات کو

مضطرب تھی کہکشاں کل رات کو

امتحاں کل رات کو

کل رات کو

رات

کو

آپ نے غور فرمایا شاعر کس سلیقہ سے نظم کو مختصر کرتا چلا آیا ہے، یہاں تک کہ آخر میں صرف "کو" کہہ کر نظم ختم کر دی ہے۔ اس نظم کا صوفیانہ تاثر حد سے بے نیاز ہے

سبحان اللہ !

اب ایک اور تجربہ حاضر ہے۔

بہاراں، بہاراں، بہاراں، بہاراں

نگاراں، نگاراں، نگاراں، نگاراں

ہزاراں، ہزاراں، ہزاراں، ہزاراں

چناراں، چناراں، چناراں، چناراں

اِس نظم کا جو مطلب ہمیں شاعر نے بتایا ہے وہ یہ ہے کہ چمن میں بہار آئی ہوئی ہے۔
اور محبوب مصروف سیر ہے لیکن سڑک چھاپ زہاد بن کر ہزار ان چمار ان کے پیچھے پڑ گئے ہیں
ظاہر ہے کہ اگر شاعر صاحب نہ بتاتے تو ہم کیا کوئی سقراط بھی اس مطلب تک نہیں پہونچ سکتا
تھا۔ حاصل اِس تمام گفتگو کا یہ ہے کہ اِس جوہری توانائی کے زمانے میں شاعری بہت زیادہ
آسان ہو گئی ہے۔ اور آج کل جو نئے نئے تجربات ہو رہے ہیں۔ اِن سے اندازہ ہوتا ہے کہ
چند روز بعد وہ یوم سعید آنے والا ہے جب ملک کا بچہ بچہ شاعری کرنے لگے گا بلکہ بطن مادر
کے باہر آنے کے بعد ہر نومولود کا پہلا کام یہ ہوگا کہ اپنے والدین کی خدمت میں مطلع عرض کرے
اور جب داد ملے تو رو رو کر آداب بجالائے!

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اِس دن تک زندہ نہ رکھے۔

۲۸ جنوری سنہ ۱۹۶۱ء

○

کل شاعری کے مختلف نمونے پیش کئے گئے تھے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری زبان
میں فن شعر کہاں سے کہاں پہونچ گیا ہے، آج تنقید کا ایک نمونہ قارئین کی نذر کیا جاتا ہے جس سے
پتہ چلے گا کہ فن نقد نے بھی ہمارے ملک میں خاصی ترقی کی ہے یہ تنقید ادب کی ایک کتاب پر
لکھی گئی تھی، ملاحظہ ہو۔

ادب کے احساس تصورات کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ حیات و کائنات کے اسرار و
رموز کی داخلی اور خارجی عکاسی و ترجمانی جب کسی خاص نقطہ نظر سے کی جائے تو اس کی عالمگیریت
مجروح ہوتی ہے، ادیب کوئی گھوڑا نہیں ہے جو اپنا منہ چاہے جدھر موڑے جب زندگی کا
سکوت وجمود ختم ہوتا ہے اور جذبات کو زبان ملتی ہے تو ایک ایسا ادیب عالم وجود میں
آتا ہے جو اپنے قلم سے حیات کے اوراق سادہ پر بوقلموں نقوش ثبت کر کے اسے تاباں و
درخشاں اور زندہ و پائندہ بنائے! کیا سمجھے آپ؟

۲۹ جنوری سنہ ۱۹۶۱ء

زندگی میں ترقی کرنے کیلئے مقابلے بہت ضروری ہیں' چنانچہ ہمیں یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ آئندہ ہونے والے جشن اُردو میں غزل گوئی کا بھی ایک مقابلہ رکھا گیا ہے' ظاہر ہے کہ اِس مقابلہ میں حصہ لینے والے شوقین مصرعہ پر مصرعہ لگائیں گے' ردیف سے قافیہ کو چپکائیں گے اور اس طرح رئیس المتغزلین کہلائیں گے۔

غزل گوئی زندگی کے لئے بہت ضروری ہے بلکہ بعض فلسفیوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ شخص زندگی کے میدان میں کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا جو غزل گوئی پر عبور کامل نہ رکھتا ہو' اسلئے ہم' ہر اس مقابلہ کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہیں کہ وہ ہمارے نوجوانوں کو بہتر سے بہتر غزل گوئی کی توفیق عطا کرے!

غزل گوئی کے بعد دوسری اصناف سخن کی جانب توجہ ہونی چاہیئے۔ مثلاً رباعی گوئی' قصیدہ گوئی' مخمس گوئی۔ نالش گوئی۔ مجش گوئی وغیرہ وغیرہ۔

یکم فروری ۱۹۶۱ء

ارسطو نے شاید کسی اور فلسفی نے انسان کو ہنسنے والا جانور کہا ہے اس قول کا ثبوت روز آدہ زندگی میں اکثر و بیشتر ملتا رہتا ہے' چنانچہ چند روز پہلے ہماری بلدیہ کے اجلاس میں بعض ارکان نے اس مقولے کی صداقت پھر ایک بار ثابت کرکے رکھ دی' ہوا یوں کہ سائیکل ٹیکس کی کمی کا مسئلہ در پیش تھا اور دو پارٹیوں کے افراد یہ کوشش کر رہے تھے کہ اس معاملہ کا اعزاز (CREDIT) خود لے لیں ایک جماعت کا بیان تھا کہ یہ مسئلہ اس کی وجہ سے معرض بحث میں آیا ہے' دوسری پارٹی کہہ رہی تھی کہ اس کا ثواب انہیں ملنا چاہیئے۔ اس دوران میں ایک فریق نے حلوائی کی دوکان اور دادا جی کی فاتحہ والی پھبتی بھی کس دی لیکن اس ہنگامہ کے باوجود یہ طے نہیں ہو سکا کہ سائیکل ٹیکس کی کمی کو کس سے منسوب کیا جائے!

اس قسم کے واقعات عموماً شاعروں کے درمیان ہوتے تھے یعنی ایک شاعر مطلع عرض

کرتا تھا اور دوسرا دعویٰ کردیتا تھا کہ یہ مطلع تو میرا ہے، پہلا جواباً فرماتا تھا کہ نہیں میرا ہے
دوسرا ذرا تلخی سے اپنے دعوے کو دھراتا تھا کہ نہیں میرا ہے، یہاں تک کہ بات بڑھ جاتی
تھی اور مطلع صاف ہو جاتا تھا یعنی پتہ چلتا تھا کہ مطلع کا اصلی مالک تو کوئی مرحوم شاعر
ہے جس کا دیوان گردشِ ایام کی وجہ سے چھپ نہ سکا! ہوسکتا ہے کہ ارکان بلدیہ کے
معاملے میں بھی تحقیق کے بعد ایسی ہی صورتِ حال رونما ہو یعنی کوئی صاحب ثابت کردکھائیں
کہ سائیکل ٹیکس کی کمی تو کسی مرحوم رکن بلدیہ نے بہت دن پہلے سوچ رکھی تھی، لیکن یہ تجویز ان کے
ساتھ ہی قبر میں ہوگئی!!! اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلیہ راجعون۔

۱۹ر فبروری ۱۹۶۱ء

○

بعض الفاظ کچھ اس قسم کے واقع ہوئے ہیں کہ ان کے تحقیقی و علمی معنی سمجھنے کی جستجو کرنا تحصیل
لاحاصل ہے، چنانچہ حضرت غالب جیسے نکتہ شناس شخص نے تنگ آکر نقشِ وفا کے متعلق
صاف صاف کہدیا ؎

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

غالب کے زمانے میں "نقشِ وفا" کا رواج تھا، ہمارے دور میں "کلچرل پروگرام"
نے اس کی جگہ لے لی ہے یعنی آپ چاہے جتنا غور و تامل سے کام لیں ہرگز یہ نہیں بتاسکتے
کہ "کلچرل پروگرام" آخر کس قسم کے پروگرام کو کہتے ہیں، اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟
اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس کے حدود کیا ہیں؟ کچھ لوگ جمع ہو جائیں اور کچھ دوسرے
لوگ گانے بجانے لگیں یا ناچنے کودنے لگیں، سمجھ لیجئے کہ کلچرل پروگرام ہو رہا ہے۔
اور خوب ہو رہا ہے!

خاکسار کو ایسے ایسے کلچرل پروگراموں میں شریک ہونے کی سعادت نصیب
ہوئی ہے جہاں اسٹیج پر ناچنے کے بجائے اچھل کود کی مشق ہو رہی تھی، راگ گانے کی بجائے

تالی و سر کا منہ چڑایا جا رہا تھا لیکن چلتے وقت یہ بھی کہنا پڑا کہ کلچرل پروگرام بہت ہی عمدہ رہا، ماشاء اللہ سبحان اللہ وغیرہ وغیرہ!

۱۹ر فروری سنہ ۱۹۶۱ء

O

حال ہی میں عرض کیا گیا تھا کہ ہماری زبان کے اکثر الفاظ اور بیشتر تراکیب کا صحیح مفہوم متعین کرنا بہت مشکل ہے، اس سلسلہ میں "نقش وفا" اور کلچرل پروگراموں کی مثالیں بھی پیش کی گئیں تھیں آج ایک ایسی چیز نظر سے گذری جس سے ہمارے ناکردہ دعوے کی تصدیق مزید ہوتی ہے اور ایک نیا لفظ تحقیق ہوا ہے جس کے معنی متعین کرنا مشکل ہیں۔ خبر یہ ہے کہ کلکتہ میں ملکہ انگلستان کا پر جوش استقبال ہوا اور تفصیلات میں بیان کیا گیا ہے کہ (۸) افراد بے ہوش اور (۱۵) زخمی ہو گئے!

آپ کے ذہن میں پر جوش کا مطلب کچھ بھی ہو، اس کے حدود میں بے ہوشی یا مرمت ہرگز شامل نہیں ہو سکتی، پر جوش کے لغوی معنی ہیں جوش سے بھرا ہوا اور یہ تعریف انسان سے لے کر شعر تک صادق آتی ہے یعنی پہلے تو کہتے ہیں کہ فلاں شخص جوش سے بھرا ہوا تھا اور اس نے نہایت ہی زوردار تقریر کر ڈالی یا یہ کہ جوش ملیح آبادی کے شعر بڑے پر جوش ہوتے ہیں لیکن یہ کہنا بڑا غور طلب معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑی شخصیت کا پر جوش استقبال ہوا جس کے نتیجہ میں لوگ زخمی بھی ہوئے اور بے ہوش بھی گویا جوش کیا ہوا ایک طرح کا "فساد ہو گیا"!

اور جب عملاً یہ ثابت ہو گیا کہ پر جوش استقبال کرنے میں "نقضِ امن" کا اندیشہ ہے تو نہیں چاہیئے کہ آئندہ ایسے معاملات میں محتاط رہیں اور صورتِ حال کو پر جوش نہ ہونے دیں، ورنہ یہ کیا بات ہوئی کہ جس شخصیت کا استقبال کرنے کے لئے آپ لوگ جمع ہوئے تھے وہ تو اطمینان سے سلام کرتی ہوئی گذر رہی ہے۔ اور آپ ہیں کہ زخمی یا

بے ہوش پڑے ہوئے ہیں !!!

۲۱ر فروری ۱۹۶۱ء

○

آپ نے ایک اشتہار ضرور پڑھا ہوگا ــــ

ــــ برخوردار .... سلمہٗ' تم اس اشتہار کو دیکھتے ہی فوراً گھر واپس آجاؤ تمہاری والدہ آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے' اور تمہارے بھائی' بہن بھی پریشان ہیں تم سے کچھ نہیں کہا جائے گا' اگر روپیہ کی ضرورت ہو تو فوراً لکھو ــ!

ظاہر ہے کہ ایسا اشتہار جو شخص بھی پڑھے گا یقیناً خوش ہوگا' اور اس میں جس برخوردار سے تخاطب ہے' اس کی مسرت تو بیان ہی نہیں کی جاسکتی' بات کو ذرا واضح کرنے کیلئے یوں سمجھئے کہ جب کوئی بچہ گھر سے بھاگتا ہے تو خالی ہاتھ نہیں ہوتا' بلکہ اس کی جیب میں گھر سے چرایا ہوا روپیہ یا زیور ضرور ہوتا ہے' جسے خرچ کرنے کے بعد وہ خودکشی کے متعلق سنجیدگی سے غور کرنے لگتا ہے۔

عین اس عالم میں مندرجہ بالا قسم کے اشتہار کا شایع ہونا بالکل ایسا ہی ہے جیسے دھان سے خشک کھیت پر پانی برس جائے' یہ معلوم کرکے کہ اس کی ماں آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے اس کے لئے روپیہ آسکتا ہے' اور یہ کہ جب وہ گھر جائے گا تو اس سے کچھ نہیں کہا جائے گا' وہ برخوردار سلمہٗ جتنے مسرور ہوسکتے ہیں قابل بیان نہیں !

آج اسی قسم کا اشتہار بمبئی کے ایک اخبار میں نظر سے گذرا جس میں ایک فلمی شاعر مخاطب ہیں۔ لکھا ہے ــــ میں آپ کی ملاقات کیلئے باندرہ گیا' جہاں معلوم ہوا کہ آپ نے گھر بدل دیا ہے۔ آپ بروز .... بتاریخ .... بمقام .... تشریف لے آئیں وہاں ایک جلسہ ہو رہا ہے اور اراکین بزم .... آپ کو نظم .... کے گیتوں پر مبارکباد پیش کرنا چاہتے ہیں !

اتنی بات بالکل واضح ہے کہ اس اشتہار کو پڑھ کر شاعر صاحب بروز.........

بتاریخ .... بمقام .... ضرور پہونچیں گے، اور اراکین بزم سے مبارکباد وصول کرکے شاداں و خراماں گھر واپس ہوں گے، اس اعتبار سے اِن اشتہارات کی افادیت ظاہر ہے، لیکن ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ ایسے اشتہارات پبلسٹی کے نقطۂ نظر سے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں، بلکہ اِن کا بیان تو یہ بھی ہے کہ فلمی شاعر ایسے اشتہارات کو طبع کرانے کے تمام اخراجات خود برداشت کرتے ہیں!

۵ر اکتوبر ۱۹۶۱ء

○

پہلے ہمارے یہاں کی فلم انڈسٹری ہالی وڈ کی تصویروں کے "پلاٹ" چرا کر اپنا پیٹ پالتی تھی، آج کل جو شاعری اس انڈسٹری سے متعلق ہیں وہ مرحوم شاعروں کے کلام کا سرقہ کرکے قوت لایموت حاصل کر رہے ہیں، مثال کے طور پر عورت کے متعلق مجازؔ مرحوم کا ایک مشہور شعر ہے ؎

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے ایک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

فلم ماڈرن گرل کے شاعر صاحب نے سوچا کہ عورت بہرحالت عورت ہے، چاہے پرانی ہو یا نئی اور شعر بہرحال شعر ہے چاہے اپنا ہو یا پرایا۔ چنانچہ انہوں نے پروڈیوسر سے رقم وصول کرنے کی خاطر فلم میں اس اچھے خاصے شعر کی مٹی پلید کرکے رکھ دی ؎

ترے ماتھے پہ اس اُڑتے ہوئے آنچل کا کیا کہنا
تو اس آنچل سے ایک گھونگٹ بنا لیتی تو اچھا تھا

بات یہاں تک پہونچ ہی گئی ہے تو ہم شاعر صاحب سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ دوسروں کے اشعار کا سرقہ کرکے پیسے بنانا کوئی مردانہ کام نہیں ہے!

۱۳ر اکتوبر ۱۹۶۱ء

O

ستم طفلاں کو تمام کرنے میں صرف "مکتب و ملا کا ہاتھ نہیں ہوتا" بلکہ بعض کتابیں اور ان کے مرتبین بھی یکساں اپنا اثر دکھاتے ہیں، مثال کے طور پر ہمارے یہاں، بی۔اے کی جماعتوں میں اردو مضمون اختیاری ہے اور علامہ اقبال کی کتاب۔بال جبرئیل داخلِ نصاب ہے، ہمارے ایک لیکچرار دوست نے ہمیں حیدرآباد کے ایک مشہور و معروف پریس کا چھپا ہوا نسخہ دکھایا جسے بعض نامعلوم اہل قلم نے کورس کے لئے مرتب کیا ہے اور طلبا کی سہولت کے لئے آخر میں بعض مشکل الفاظ کے معنی بھی دیئے گئے ہیں، ہم نے جب اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر اس مختصر سی ڈکشنری کو پڑھا تو واقعی ہماری معلومات میں بہت اضافہ ہوا، اس لیے کہ اس میں قرطبہ کے معنی لکھے ہیں، مصر کا ایک مشہور شہر!

پہلے تو ہم سوچتے رہے کہ شاید جب علامہ اقبال زندہ تھے اس وقت قرطبہ کا محل وقوع اسپین میں ہو، لیکن بعد میں مرورِ زمانہ اور گردشِ ایام کی وجہ سے یہ شہر مصر کی طرف چلا آیا ہو، کہ وہاں کی آب و ہوا بھی اچھی ہے اور اہرام اور دریائے نیل کی وجہ سے یہ ملک عالمی سیاحوں کا مرکز بنا رہتا ہے!

اس کتاب میں دوسرے مشکل الفاظ کے جو معنی دیئے گئے ہیں انہیں ہم یہاں درج کیے دیتے ہیں، قارئین کرام خود سمجھ لیں کہ بی۔اے میں مضمون اختیاری کے طور پر جو طلباء حضرات اقبال کی بال جبرئیل .... پڑھیں گے ان کا کیا حشر ہوگا!

ملاحظہ ہو مشتے نمونہ از خروارے

بابر ۔ تیمور کا باپ

بے کنار ۔ بے عشق بے گوشہ

ارم ۔ شداد کا باپ

جولانگاہ ۔ گھوڑدوڑ کا میدان

وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ

ظاہر ہے کہ اب بابر زندہ نہیں ہے، جو اپنے باپ کی حیثیت سے مرزا بانصیر بن شاہ رخ کی جگہ تیمور کا نام دیکھ کر مشتعل ہو جائے اور اس کتاب کے مرتبین پر حملہ یا دعوےٰ کرے۔ اسی طرح بے کنار کے معنی "بے عشق، بے گوشہ" لکھ دینے سے بھی کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی اس لئے کہ آج کل جو خواتین علی العموم "بے گوشہ" پھرتی ہیں وہ "بے عشق" بھی ہوتی ہیں، اور چونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لئے انھیں بے کنار بھی کہا جا سکتا ہے!

ارم کے معنی شداد کا باپ لکھ کر مرتب کتاب ہٰذا نے علامہ اقبال کے اس مصرعہ کی نئی تفسیر کرنی چاہی ہے ؎

ارم بن گیا دامن کوہسار

اب اس مصرعہ کی شرح یہ ہوگی کہ دامن کوہسار نے ترقی کی اور وہ جمادات کی منزل سے گذر کر "حیوانات" کی صف میں داخل ہو گیا، یہاں تک کہ اس پہاڑ کے دامن کو اللہ تعالیٰ نے شداد کا والد بنا دیا!

ہماری طرح یہ معلوم کر کے آپ بھی یقیناً خوش ہوں گے کہ جولانگاہ کے ایک معنے گھوڑدوڑ کا میدان بھی ہیں، آخر ریس کورس پر مختلف نسلوں کے گھوڑے جس "جولانیٔ طبع" سے کام لیتے ہیں، وہ رائیگاں جانے والی چیز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال بھی ایک مصرعہ میں یوں فرما چکے ہیں۔

اسی جولانگاہ زیر آسماں سمجھا تھا میں

اگر ہم جولانگاہ سے گھوڑدوڑ کا میدان مراد کر لیں تو مصرعہ کا مفہوم اور بھی نکھر جاتا ہے اور یہ معنے ظاہر ہوتے ہیں کہ شاعر اپنی فہم و فراست سے کام لے کر اس نتیجہ تک پہونچا تھا کہ گھوڑدوڑ کا میدان ہمیشہ آسمان کے نیچے واقع ہوتا ہے اور آسمان کے اوپر ہرگز نہیں بنایا جا سکتا

لہذا شاعر نے جو کچھ سمجھا تھا سچ سمجھا تھا اور مرتب کتاب نے جو معنی لکھے ہیں وہ اور بھی سچ ہیں!

یہ کتاب ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے، اس کتاب کو پڑھکر جو لوگ گریجویٹ بنیں گے وہ اُردو کی بڑی خدمت کریں گے۔

میر۔ غالب۔ اور اقبال سب کی روحیں تڑپتی رہیں گی اور جامعہ عثمانیہ کے اُردو کے اساتذہ کو دعائیں دیتی رہیں گی!

۱۸ اکتوبر ۱۹۶۶ء

O

جو لوگ زیادہ باتیں کرتے ہیں انھیں ہندی میں باتونی اور فارسی میں "چرب زبان" کہتے ہیں اور کبھی اِن کی عملی سرگرمیوں کو "بکواس" کا خطاب بھی دے دیا جاتا ہے۔ اگر ایسے حضرات لیڈر بنیں تو بہت قابل اور مفید سمجھے جاتے ہیں اس لئے کہ لیڈری کے پیشہ میں بعض اوقات محض باتیں ہی باتیں کافی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ان لوگوں کو ذمہ داری کا کوئی کام سونپا جائے تو نتائج عموماً خراب نکلتے ہیں، اس لئے کہ صرف باتیں ہر موقع و محل پر کام نہیں دے سکتیں!

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا جو اردو زبان کی روایت کے خلاف بات کی ابتدا ہی میں آن کودا ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ چند روز پہلے سڈنی (آسٹریلیا) میں کسی صاحب نے مسلسل بولتے رہنے کا ایک مقابلہ منعقد کیا جس میں ایک شخص نے جو جنوبی افریقہ کا باشندہ ہے تواتر کے ساتھ دو سو گھنٹے تک بول کر کامیابی حاصل کی۔ لیکن سنا ہے کہ وہ شخص ابھی تک بے تکان بولتے جا رہا ہے، اس لئے کہ مقابلہ منعقد کرنے والے بزرگوار انعام دیئے بغیر فرار ہو گئے ہیں ظاہر ہے کہ اب اس مسلسل بولنے والے شخص کا موضوع سخن بدل گیا ہو گا، اور وہ مقابلے کے منتظمین کو گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا ہو گا۔ موجودہ حالات میں اس سوال کا جواب صرف وقت ہی دے سکتا ہے کہ مقابلہ جیت کر بھی انعام سے محروم رہنے والا ماہر فن کتنے دن تک اس دشوار گزار راستے میں گامزن رہ سکتا ہے۔

نطق کا یہ اثر رہا م دیکھئے کب تک رہے ؟

ہمارے یہاں جو لوگ ہندی میں باتونی اور فارسی میں چرب زبان کہلاتے ہیں انھیں اس واقعہ سے سبق لینا چاہیئے اور یہ محسوس کرنا چاہیے کہ جس طرح ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی اسی طرح ہر وہ شخص جو زیادہ بولتا ہے وہ مستحق انعام قرار نہیں پا سکتا!!!

۲۵ر دسمبر ۱۹۶۱ء

○

ظاہر ہے کہ "بال" کوئی ایسی شئے نہیں جو کھال رکھتی ہو، پھر بھی ہماری زبان میں بال کی کھال نکالنا ایک بہت قدیم اور مستند محاورہ ہے اور اس کا صحیح محل استعمال اساتذہ اردو سے معلوم ہو سکتا ہے!

مثال کے طور پر ایک اسکول کے ماسٹر صاحب درسی کتاب کا یہ شعر ؎

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے ٭ دلِ بے مدعا دیا تو نے

یوں سمجھاتے تھے کہ لڑکو تمہیں دنیا کی مختلف چیزیں مثلاً لباس، جوتے، گھڑی، سائکل وغیرہ تمہارے والد صاحب دلا سکتے ہیں لیکن دلِ بے مدعا ایک ایسی چیز ہے، جو صرف اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے، یہ اندازِ تفہیم بال کی کھال نکالنا نہیں تو اور کیا ہے؟

ایک دوسرے استاد کے متعلق مشہور ہے کہ جب پڑھاتے وقت یہ شعر سامنے آیا ؎

دی موذن نے شبِ وصل اذاں پچھلی رات
ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

تو موصوف نے اس کی شرح یوں فرمائی کہ عاشق پابند صوم و صلوٰۃ تھا، اور جب وصل کی شب اسے محبوب کے پہلو سے اٹھ کر مسجد کی طرف جانا پڑا تو فطری طور پر ناگوار گذرا اور غصہ میں اس نے یہ شعر کہہ دیا، اس تشریح کو بھی آپ بال کی کھال نکالنے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ بلکہ ہمارے خیال میں تو اسے شاعر کی کھال اتارنے سے بھی تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

۲۶ر اکتوبر ۱۹۶۱ء

○

یہ قطعہ شاید آپ نے بھی سنا ہو ؎

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اور اگر حالات اور واقعات پر گہری نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ ہندوستان میں اس زبان کی دھوم آج تک باقی ہے فرق صرف یہ ہے کہ داغؔ مرحوم کے زمانے میں سارا دھوم دھڑاکا اردو کی حمایت کے لئے ہوتا تھا اور آج اِس کی مخالفت کے نقارے بجائے جا رہے ہیں، چنانچہ آپ کو یاد ہی ہوگا کہ کچھ دن پہلے شمالی ہند کی بعض ریاستوں کے ان اخباروں نے اردو کو بُرا بھلا کہا جو خود اردو میں شائع ہوئے تھے۔

اور اب تو اردو کی مخالفت بڑی حد تک مضحکہ خیز ہو گئی ہے، مثال کے طور پر اس ہفتہ کی بات ہے، راقم الحروف بمبئی سے حیدرآباد آرہا تھا، اوپر کی سیٹ پر لیٹا ہوا بڑے آرام سے دیوانِ میرؔ پڑھ رہا تھا، یکایک نیچے کی سیٹوں سے مختلف آوازیں آنی شروع ہوئیں!

دیش کی زبان اردو نہیں ہندی ہے، اردو بھی کوئی زبان ہے، اس میں ذرا مٹھاس نہیں ملک کے ہر نوجوان کو ہندی سیکھنی چاہیئے۔ اردو کا وطن اب ہندوستان نہیں پاکستان ہے، وغیرہ وغیرہ۔

بہت دیر تک یہ گفتگو سنی گئی لیکن جب طاقت برداشت جواب دے گئی تو یہ خاکسار نیچے اترا اور ان ہمسفر دوستوں سے ادباً عرض کیا۔

آپ لوگ کس زبان میں باتیں کر رہے ہیں؟

کسی گجراتی بھائی نے جواب دیا۔ اپنی ہندی میں!

اب آپ ہی غور فرمائیے کہ اگر یہ ہندی تھی تو بہت خوب تھی۔

بات یہ ہے کہ نہ اُردو کا کام بغیر ہندی کے چل سکتا ہے اور نہ ہندی بغیر اُردو کے

آگے بڑھ سکتی ہے، لیکن یار لوگ ہیں کہ ان دونوں "بہنوں کے" درمیان دیوار بنے کھڑے ہیں ۔

۳۰ر نومبر ۱۹۶۱ء

○

ایک خبر کا عنوان یوں چھپا ہے "دق کا یونانی علاج ـــــ تقریر"! اس پر ہمیں استاد داغ کا ایک مقطع یاد آیا ہے

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو ۔ کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

اور ہم اس بات کے بالکل ہی قائل ہو گئے کہ اردو زبان میں الفاظ کا استعمال آسان نہیں ہے، اب خبر کے اسی عنوان کو دیکھ لیجئے، لکھنے والے کا مطلب یہ تھا کہ "دق کا یونانی علاج" ایک موضوع ہے، جس پر کوئی صاحب تقریر فرمانے والے ہیں، لیکن الفاظ کی نشست کچھ ایسی ہے جس سے یہ مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے کہ یونانی طریقہ علاج کے مطابق دق جیسے موذی اور خطرناک مرض کو "تقریر" کے ذریعہ سے بھی دور کرنا ممکن ہے، اور اگر کسی محقق نے مذکورہ عنوان کو اسی مفہوم میں لے لیا تو وہ یہ ثابت کرنے پر تل جائے گا کہ یونان قدیم میں جو حکما اور اطبا گذرے ہیں وہ دق کے مریضوں کو سامنے بٹھا کر تقریر کیا کرتے تھے ۔ اور اللہ تعالیٰ انھیں شفا دے دیا کرتا تھا ۔ یہاں بھی وہی زبان کی مشکل آپڑی ہے، ہمارا مطلب یہ ہے کہ حکیموں کو نہیں مریضوں کو شفا ہو جاتی تھی!

زبان سے قطع نظر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ کم از کم ہمارے ملک میں "تقریر" بہت سے امراض کے لئے دافع اور نافع ہے، مثال کے طور پر شاید شیخ بو علی سینا نے یا حکیم فیثا غورث نے کہیں لکھا ہے کہ اگر میعادی بخار میں مبتلا شخص مسلسل بولتا رہے تو اس کی حرارت کم ہو جاتی ہے اور جسم کے اندر جو حدت ہوتی ہے وہ زبان کے ذریعہ باہر نکل جاتی ہے ۔ بعض ذہنی اور روحانی امراض کے لئے "تقریر" کی افادیت مسلمہ ہے، فرض کیجئے کہ آپ کی اولاد خدانخواستہ "ناخلف" ہوتی جا رہی ہے ایسے عالم میں آپ اصلاح کی جو مہم چلائیں گے

اس کی ابتدا تقریر ہی ہو گی کہ دیکھو برخوردار ...... !

جب کسی قوم میں انتشار پیدا ہوتا ہے تو یکجہتی اور اتحاد کے لئے سب سے پہلے تقریریں ہی کی جاتی ہیں، اور اگر ان سے کام نہیں چلتا تو بعد میں بھی تقریریں ہی کرنی پڑتی ہیں گویا تقریر سے کسی حالت میں مفر نہیں۔ مگر تقریر میں بھی فرق ہوتا ہے، مثلاً ایک تقریر مردہ ہوتی ہے جس کے لئے مومن مرحوم نے یوں لکھا ہے ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں ؛ واں ایک خامشی مرے سب کے جواب میں

دوسری قسم کی تقریر کے متعلق غالب مغفور نے اس طرح فرمایا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا ؛ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی مرے دل میں ہے

۶ دسمبر ۱۹۶۱ء

○

آپ نے اردو زبان کا یہ مشہور شعر سنا ہو گا ؎

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس ؛ یہ وہ جامہ ہے جس کا نہیں الٹا سیدھا

بیچارے مرحوم شاعر کو کیا خبر تھی کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب تن کی عریانی من کی عریانی بن کر کئی فنونِ لطیفہ میں سرایت کر جائیگی اور سیدھے راستے کا اختیار مشکل ہو جائیگا

یہ شعر ہمیں ایک خبر پڑھ کر یاد آیا، اس خبر میں بتا گیا ہے کہ چند روز پہلے نیویارک میں فرانس کے مشہور و مقبول مصور ہنری میی کی تصویریں نمائش کے لئے رکھی گئیں، ان تصویروں کو ایک ہفتہ تک تقریباً دو لاکھ اہلِ ذوق دیکھتے رہے لیکن کسی نے بھی اس تصویر کی طرف توجہ نہیں کی جو الٹی لٹکی ہوئی تھی یہاں تک کہ خود مصور کا بیٹا بھی اس غلطی سے باخبر نہ ہو سکا۔ آخر کار ایک خاتون نے جو چشم بینا رکھتی تھی منتظمین کو متوجہ کیا، اور بتایا کہ فلاں تصویر الٹی آویزاں ہے اور شائقین سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب سے فنون لطیفہ میں MODERN ART کی مبہم اصطلاح رائج

ہوتی ہے اور "ماورائیت" وغیرہ جیسے الفاظ استعمال میں آنے لگے ہیں، سیدھے تُلٹے کا امتیاز بڑی حد تک اٹھ گیا ہے آپ ایک کاغذ پر چند آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ دیجیے تھوڑے سے دھبے ادھر ادھر لگا دیجیے، اور اس کے نیچے عنوان لکھ دیجیے "حسن مغموم" نقادوں کی مجال نہیں کہ آپ کے موقلم کو روک سکے یا آپ سے پوچھ سکے کہ بھائی صاحب مختلف رنگوں کے اس اجتماع خصوصی میں "حسن مغموم" کدھر چھپا بیٹھا ہے۔ ایسے عالم میں اگر ایک تصویر اُلٹی لٹک گئی تو کونسی قیامت آگئی ؟

یہ طرز فکر مصوری ہی میں نہیں شاعروں میں بھی روز افزوں ترقی کر رہا ہے، ہمارے یہاں ایسی ایسی منظومات لکھی جا رہی اور شائع ہو رہی ہیں جن میں روح اور معنی تو درکنار سر اور پیر کا فقدان ہوتا ہے ۔ اور پوری نظم پڑھنے کے بعد خیال آتا ہے کہ وقت بیکار ضائع کیا ۔ اگر نظم پڑھنے کے بجائے چائے ہی پیتے رہتے تو بہتر تھا، ایسی نظموں کو اگر آپ اوپر سے نیچے تک پڑھیں تب بھی کوئی بات نہیں بنتی اور اگر نیچے سے اوپر کی طرف مطالعہ کریں اور اس وقت بھی کوئی معنی پیدا نہیں ہوتے مختصر یہ کہ اگر اس قسم کے ماورائی شاہکار کسی رسالے میں اُلٹے چھاپ دیے جائیں تو بھی ان کے وجود کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں !

ہمیں ذاتی طور پر علم نہیں سنا ہے کہ موسیقی میں بھی بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں صرف آوازیں نکلتی ہیں، سُر اور مفہوم کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا ۔ اگر یہ صحیح ہے تو اللہ ہمارے فنونِ لطیفہ پر پہلی فرصت میں رحم کرے !

۱۹ر ڈسمبر ۱۹۶۱ء

○

لکھنو میں شاعروں کی کثرت کا ذکر کرتے ہوئے ایک مرتبہ حضرت ظریف لکھنوی نے فرمایا تھا کہ "شاعر اسی فیصدی تعلیم سو میں سات کی" انصاف کی نظر سے دیکھئے تو آج کل ہمارے حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں بھی ایسی ہی صورت حال پیدا ہو چکی ہے ۔ اگر آپ

شام کے وقت ہوٹلوں اور چائے خانوں کا جائزہ لینے کی فرصت نکال سکیں تو یہ منظر نظر آئے گا کہ ہر ایسے مقام پر دو چار یا پندرہ میں شاعر ضرور موجود ہیں جو مصرعہ طرح پر گرہ لگا رہے ہیں یا سموسے کے ساتھ کسی دوست کا مقطع حلق سے نیچے اتار رہے ہیں شاعروں کی کثرت کو تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کر دیجئے کہ گلی ڈنڈا کھیلنے یا کوچہ گردی کرنے سے شاعری بدرجہا بہتر ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ ہمارے یہاں بے شمار اور قطار در قطار ادبی انجمنیں بھی نمودار ہو گئی ہیں تقریباً ہر محلہ میں ایک انجمن ہے بعض بڑے محلوں میں تو بہ یک وقت کئی کئی انجمنیں برسرکار ہیں' اس کے باوجود اچھے ادب کی تخلیق اتنی سست ہے کہ عوام کے کانوں میں جوں تک نہیں رینگتی !

دروغ بر گردن راوی سننے میں آیا ہے کہ ہمارے یہاں ایسی انجمنیں بھی موجود ہیں' جو ہفتہ وار یا ماہانہ مشاعرے کرتی ہیں' اور ختم مشاعرے پر شرکائے محفل کو نہاری کلچے کھلاتی ہیں اور اگر بجٹ کسی وجہ سے متوازن نہ رہے تو حاضرین کو فی کس ایک پیالی چائے اور ایک کلچے سے نوازتی ہیں۔

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو بہت حوصلہ افزا ہے۔ اکثر شاعروں کو بھی اللہ تعالیٰ نے معدہ دیا ہے وہ شعر سنائیں گے تو کچھ کھائیں گے بھی ضرور پھر۔ آخر پیٹ سے بے نیاز ہو کر کوئی کس طرح گرمِ سخن رہ سکتا ہے۔

فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

ترقی کی رفتار یہی رہی تو وہ دن دور نہیں جب بعض دوسری تقریبات کی طرح ہمارے مشاعروں میں بھی بعد ختم محفل ایک ایک شیرمال تقسیم ہوا کرے گی' اور رواج قدیم کے مطابق شاعروں کو دو حصے یعنی دو شیرمالیں ملیں گی جو ایک اوسط درجہ کے آدمی کے لئے پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہیں!!!

۲۴ دسمبر ۱۹۶۱ء

○

روزنامہ امروز" کراچی پاکستان میں نئی نسل کے شاعروں کا کلام فصاحت التیام نقل ہوا ہے یہ کلام اس قدر دلکش اور دلکشا ہے کہ ہم اپنے قارئین کو اس سے محروم رکھنا نہیں چاہتے نمونتاً کلام پیش ہے ؎

میری آنکھ میں سورج کا دانت
میں بکتا رہتا ہوں
اور کھا جاتا ہوں

دوسرا نمونہ کلام یہ ہے ؎

پچھلی بہار میں میں نے کھائے۔
ہرے ہرے طوطے
اور سینگوں والے بیل
چڑیاں انڈے
اب میرا پیٹ عجائب خانہ ہے!

افسوس ہے کہ ہمیں نظم کے آخری ٹکڑے سے اتفاق نہیں جو شاعر اس قسم کی بے پناہ شاعری کر رہے ہیں' اس کا پیٹ نہیں دماغ عجائب خانہ ہونا چاہیئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ شاعر اپنے پیٹ ہی سے شعر کہتا ہو اور دماغ کو اس کام میں بالکل دخل نہ ہو!

جب یہ دونوں مختصر شاہکار ان ادب شاعر سیاست تک پہونچے تو انہوں نے مسکراتے ہوئے یوں فرمایا!

میری ناک میں روس کا راکٹ ہے۔

میں پڑھتا رہتا ہوں
اور پڑھتے پڑھتے اُڑ جاتا ہوں

دوسرے نمونے کلام پر غور کرنے کے بعد ارشاد ہوا،

گذشتہ جاڑوں میں میں نے چبائے
اخروٹ بادام اور لکڑ بھگے
موٹریں اور ریل کے انجن
پتھر آلو بخارے
اب میں تعین النفس میں مبتلا ہوں

ہم تو اب تک اسی بات کا رونا رو رہے ہیں کہ ہمارے ملک میں شاعری میں جو نئی تراش خراش آرہی ہے۔ وہ ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے اب پتہ چلا کہ پڑوسی ملک کی حالت بھی کچھ مختلف نہیں۔ وہاں بھی شاعر بھائی لوگ اس درجہ جدت پسند ہوگئے ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی

اس موقعہ پر کسی استاد کا کیا خوب شعر یاد آیا ہے۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں ✲ تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

۵ر فبروری ۱۹۶۲ء

○

عاشقی میں خاص کر اردو شاعری میں مرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک انسان یا ایک عاشق زندگی میں صرف ایک ہی مرتبہ عدم آباد کا سفر اختیار کرے یعنی جو شخص عشق کرتا ہے وہ جب چاہے مر سکتا ہے، اس کے علاوہ ایک ہی حیات مختصر میں کئی بار مر سکتا ہے اس صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی شاعر نے جو یقیناً عاشق بھی تھا ایک مرتبہ جھنجلا کر یوں کہدیا تھا کہ ؎

مارو بھی جلاؤ بھی آسان ہے سب تم کو ٭ آنکھوں میں ہلاہل ہے ہونٹوں پہ مسیحائی

ملاحظہ فرمائیے کتنا رقت انگیز شعر ہے جس میں محبوب سے مخاطب ہو کر صاف صاف لفظوں میں کہدیا ہے کہ تمہارے لئے مارنا اور جلانا بہت آسان ہے جب تم ہمیں دیکھو گے ہم مر جائیں گے۔ اور تم ہم سے بات کرو گے ہم پھر کفن پھاڑ کر زندہ ہو جائیں گے اور یہ عمل زندگی میں بار بار دہرایا جا سکتا ہے کہ عشق کے معاملات قانون کے پابند نہیں ہیں!

خیر یہ تو تھی عشق کی بات، لیکن ایک نئی خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے اور جینے کی یہ کرامات اب سائنس سے بھی متعلق ہو گئی ہے۔ یعنی بلجیم میں ایک ایسا نوجوان منصۂ شہود پر آیا۔ ہے جو چار مرتبہ مر چکا ہے۔ لیکن چونکہ اس کا دل مصنوعی ہے اس لئے اسے چاروں مرتبہ زندہ کر لیا گیا ہے!

مصنوعی دل سے بڑی آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ فرض کیجئے کوئی شخص انتہائی مقروض ہے، جب قرض خواہ اس سے تقاضا کرتا ہے تو وہ فوراً مر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مردے سے لین دین نہیں ہو سکتا، اس لئے قرض خواہ لامحالہ واپس چلا جائے گا اور جب اس کے قدموں کی چاپ دور ہو جائے گی وہ مرحوم پھر اٹھ کر بیٹھ جائے گا۔

۲ مارچ ۱۹۶۲ء

○

اردو اور ہندی کے جھگڑے کو یار لوگوں نے بہت ہوا دی اور بہت اچھالا۔ مگر حقیقت صرف اتنی ہی ہے کہ اگر آسان اردو کو ناگری لیپی میں چھاپ دیا جائے تو وہ ہندی بن جائے اور اگر سرل ہندی کو فارسی رسم الخط میں منتقل کر دیا جائے تو وہ اردو کہلائے گویا بقول شاعر

حرم و دیر کے جھگڑے ترے جینے سے پڑے
تو اگر پردہ اٹھا دے، تو تو ہی تو ہو جائے

سچ بات یہ ہے کہ دونوں زبانوں کے علماء اور علامہ حضرات اس کشمکش کے ذمہ دار ہیں،
اس وقت خاکسار راقم الحروف کو وہ زمانہ یاد آرہا ہے جب قاضی عبدالغفار مرحوم نے حیدرآباد
سے روزنامہ "پیام" جاری کیا تھا۔ اس زمانے میں یہاں یونیورسٹی اور دارالترجمہ کی طرف سے
اردو کو گرانبار کرنے کی مہم چلائی جا رہی تھی۔ لینس (LENS) کی جگہ "عدسہ" اور "پاستیل" ہنس
کے بجائے قطار خصوصی جیسے الفاظ مستعمل تھے، یہاں تک کہ دفتر معلومات عامہ کی طرف سے
کے جو اعداد و شمار اخبار کے دفتر پہ بغرض اشاعت آتے (PRESSED COTTON)
تھے ان میں مقدمہ کے طور پہ یہ عبارت لکھی ہوتی تھی۔

"تختہ گٹھ ہائے پنبہ داب شدہ در گرنی باد"

جس کا سیدھا سادھا مفہوم تھا۔ مشینوں میں دبائی ہوئی روئی کی گانٹھیں
اچھی طرح یاد ہے کہ ہم لوگ اس جملہ کو جس میں اتفاق سے شاعری کا ایک بحر پیدا ہوگئی تھی کسی
موزوں دھن میں فٹ کر کے گایا کرتے تھے، کہ ایک مرتبہ قاضی صاحب تشریف لائے۔
یہ زبان کے مسئلہ کی ایک انتہا تھی، دوسری انتہا آج کل دیکھنے میں آرہی ہے۔ اور
جہاں تک آل انڈیا ریڈیو کا تعلق ہے سننے میں بھی آرہی ہے، خبریں ایسی زبان میں نشر کی جاتی
ہیں کہ سننے والوں کی معلومات میں اضافہ درکنار انا پہ ایک طرح کی بے خبری طاری ہو جاتی ہے
اور وہ زبان حال سے یوں کہنے لگتے ہیں ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ؛ کچھ ہماری خبر نہیں آتی،

ذرا آپ ہی غور فرمائیے اگر ہمارے ہندی والے بجائے "یونائیٹڈ پریس" کا ترجمہ
"متحدہ صوبہ" کریں اور سپلی منٹری کو بجائے (SUPPLEMENTRY QUESTION) کو
"دم سوال" کہیں تو سنتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی انسان کو دم نکل آئی ہے، اور
وہ اچھی خاصی زبان کو تباہ کرنے کے لئے جت گیا ہو۔

○

شاید آپ کو یاد ہو کہ کچھ دن پہلے اورنگ آباد میں ایک فری اسٹائل مشاعرہ ہوا تھا' مشاعرہ جیسی مہذب محفل کے سلسلہ میں فری اسٹائل کی اصطلاح پڑھ کر حیرت زدہ یا چیں بہ جبیں ہونے کی ضرورت نہیں یہ مشاعرہ کچھ اسی قسم کا تھا یعنی جب شاعروں کی ہنگامہ آرائیاں' اور بیہودگیاں بڑھ گئیں تو یار لوگوں نے چند ناشاعروں کو ایک کمرے میں بند کر کے خوب خوب زدوکوب کیا اور داد کے بجائے بیداد کی طرح ڈال دی !

اور اسی اورنگ آباد سے اب یہ خبر آئی ہے کہ وہاں کی ایک "بزم ادب" میں جب ہندستان کے کسی مشہور شاعر کو مدعو کیا گیا اور اس بیچارے نے حالات کا بغور مطالعہ فرمایا تو کلام سنانے کے بجائے غائب ہو جانے ہی میں مصلحت دیکھی۔ اس قسم کی خبریں پڑھ پڑھ کر ہماری رائے یہ ہے کہ ایسے ہنگامہ خیز مشاعروں میں حکومت کو مداخلت کرنا چاہیئے۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو کم سے کم یہ تو نہایت ضروری ہے کہ شعر پر ٹیکس لگا دیا جائے۔

اس سلسلے میں مشاعروں کی وہ قسم بھی بڑی تکلیف دہ اور مضحکہ خیز ہوتی ہے جو کسی تقریب کے ساتھ ملحق ہے' مثلاً آپ اپنے بھتیجے کی شادی کر رہے ہیں اور اس کے پروگرام میں ایک عدد مشاعرہ بھی شامل ہے۔ یا کسی صحافت کی طرف سے فلم ایوارڈ فنکشن وغیرہ کا ہنگامہ برپا کیا جا رہا ہے۔ اور اس میں بالکل ضمنی طور پر مشاعرہ کو بھی گھسیٹ لیا گیا ہے۔ ایسے مشاعروں میں شاعروں کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہوتی جتنی کہ پرانے زمانے میں بھانڈوں کی ہوتی تھی !

۱۲ مئی سنہ ۱۹۶۲ء

○

جہاں تک ہماری یادداشت کا تعلق ہے زبان کے مسئلہ پر غالباً سب سے پہلے

مرزا غالب نے حسبِ ذیل شعر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو توجہ دلائی تھی

"یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور"

واقعہ یوں ہوا کہ ایک دن حضرتِ غالب اپنے محبوب سے ملنے گئے اور دورانِ گفتگو میں اپنی اردوئے معلیٰ استعمال کرنی شروع کر دی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا سیدھا سادھا محبوب جو عوام الناس سے تعلق رکھتا تھا ہکا بکا رہ گیا اس پر غالب بہت افسردہ خاطر ہوئے اور گھر پہونچ کر نہایت خشوع و خضوع سے مندرجہ بالا شعر موزوں کیا افسوس ہے کہ اس آہ و زاری کے نتائج ہمیں معلوم نہیں۔

زبان کی اس تاریخ نے چند روز پہلے اپنے آپ کو پھر دہرایا ہے یعنی آل انڈیا ریڈیو سے جو ہندی نشر کی جاتی ہے اُسے آسان بنانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، ہم سو فیصدی اس مطالبہ کے ساتھ ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری راشٹر بھاشا یعنی ہندی پھلے پھولے اور ترقی کرے، ظاہر ہے کہ یہ مقصد اس کے عام فہم ہونے ہی سے پورا ہو سکتا ہے۔

لیکن صرف ہندی ہی کو آسان بنانے سے کام نہیں چل سکتا اس کی بہن اُردو کو بھی اس سطح پر لانا چاہئیے تاکہ دونوں عالمگیر ہو کر زیادہ سے زیادہ ملک کے کام آئیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف تو بعض منچلے ہندی کا دامن پکڑ کر اسے سنسکرت کی جانب کھینچے لئے جا رہے ہیں اور دوسری طرف اُردو کے وہ قابل ترین افراد ہیں جو اس زبان کو عربی اور فارسی کی کاربن کاپی بنانے پر مصر ہیں اس سلسلہ میں ایک مرتبہ پنڈت سندر لال جی نے کیا خوب مثال دی تھی کہ اردو میں ایک لفظ آخر موجود ہے جو مختلف موقعوں پر کام دیتا ہے لیکن اُردو کے دوست نما دشمن اس سے مطمئن نہیں ہیں انہوں نے اس میں ایک دوسرے لفظ کا اضافہ کر کے آخر کار بنایا اور جب اُن کے علم کی تشنگی اس طرح بھی نہیں بجھی تو آخر کو بالآخر کر دیا۔

ابھی کل ہی ہم نے بمبئی کے کسی ہفتہ وار میں ایک مضمون پڑھا جس میں مضمون نگار نے کسی حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "وہ روز روشن کی طرح اظہر من الشمس ہے"۔

اب آپ ہی غور فرمائیے کیا اس قسم کی عبارتیں ہوش و حواس کی پیداوار ہوسکتی ہیں حد ہوگئی کہ روز روشن کے استعمال سے لکھنے والے کی تسلی نہیں ہوئی اور اس کے بعد اس نے اپنے پڑھنے والوں پر اظہر من الشمس کا پتھراؤ کر ہی دیا' روز روشن کی طرح اظہر من الشمس لکھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی برگ حنا کے پتے لکھے یا شب لیلۃ القدر کی رات کا بیان کرے یا یوں کہے کہ میں بیماری کی علالت کا مریض ہوں!

۶ جون سنہ ۱۹۶۲ء

○

ہماری دنیا میں بعض سر پھرے لوگ ایسے بھی موجود ہیں' جو شعر و شاعری کو کار بیکاراں سمجھتے ہیں' اور اس فن کی افادیت کو تسلیم نہیں کرتے لہٰذا آفریں ہو بھوپال کے اس کاشتکار شاعر پر جس نے مترنم شاعری کے ذریعہ ایک ایکڑ زمین میں (۴۰) من گیہوں پیدا کر کے نہ صرف یہ کہ پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں بلکہ ایک ایسا ریکارڈ قایم بھی کر دیا ہے جسے توڑنے کی کوشش میں شاید بہت سے غیر کاشتکار حضرات اپنا سر توڑ بیٹھیں۔

اس شاعر بے بدل نے اپنی زمین میں کاشت کو ترقی دینے کے لیے تمام عصری ذرائع استعمال کئے اور ان کے علاوہ اپنے شعر ترنم سے بھی کام لیا یعنی اس کا طریقہ کاشت یہ تھا کہ تخم ریزی کے بعد وہ کھیت کے کنارے بیٹھ کر نہایت ہی جذبات خیز اور ہیجان انگیز اشعار بہت ہی دلنشین ترنم کے ساتھ پڑھتا رہتا تھا اور گیہوں کے پودوں میں بالیدگی پیدا ہوتی رہتی تھی۔

شاعری کی ایک ادبی تعریف یہ ہے کہ وہ انسانی روح کو متاثر کرتی ہے' پس اگر گیہوں کے خوشوں پہ اس کا اچھا اثر پڑا تو مقام حیرت نہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے

بھوپال کے اس شاعر کا یہ تجربہ عام کر دیا جائے یعنی ملک میں زیادہ غلہ اگانے کی جو مہم چل رہی ہے اسے کامیاب بنانے کے لئے دوسرے لوگوں کے ساتھ شاعروں کی خدمات بھی حاصل کی جائیں ان شعرا کی ڈیوٹی مختلف کھیتوں پر لگائی جاسکتی ہے ۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ آج شہروں میں جو کثرت سے مشاعرے ہو رہے ہیں انھیں کھیتوں کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ شعرا گیہوں جوار چنا، باجرہ اور مکئی وغیرہ کے کھیتوں میں بیٹھ کر زور دار آواز وں میں اشعار سنائیں، اور اناج کی فصلوں میں اضافے کا سبب بنیں۔

اس سلسلے میں صرف یہ انتظام کرنا ہوگا کہ چونکہ شعرا بھی پیٹ رکھتے ہیں۔ اس لئے فصل کٹنے پر انھیں بھی فی کس ایک پلہ اناج دیا جائے تاکہ وہ آئندہ فصل تک جسم و جان کا تعلق باقی رکھ سکیں گے۔

۷ر جون ۱۹۶۲ء

○

ایک تو ہوتا ہے علمی ادبی محقق جو کبھی کبھی کسی شاعر کو زور تحقیق میں دو دفعہ مار ڈالتا ہے اور بعض اوقات کسی مردہ اہل قلم کو صورت بنا کر پیش کرتا ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور محقق بھی ہمارے ملک میں پایا جاتا ہے جو تاریخی یا سیاسی میدان میں اپنی فکر کے گھوڑے دوڑاتا ہے اور اچھی خاصی خاک اڑا کر رکھ دیتا ہے ۔

حال ہی میں خاکسار کو ایک ایسے ہی محقق کی تقریر سنی جو بڑے دعوے کے ساتھ فرما رہے تھے کہ ہندستان عدم تشدد کے ذریعہ آزاد نہیں ہوا ہے بلکہ اسے تشدد کے ساتھ آزاد کروایا ہے ۔ اس سلسلہ میں موصوف شاید کچھ دلیلیں پیش کرنا چاہتے تھے مگر مجمع کا رنگ دیکھ کر خاموش رہ گئے اور تقریر ختم کر دی۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمات کو مفروضات کا مقام دینا، دن کو رات بنانا اور ٹوپی کے اندر سے خرگوش برآمد کرنا بڑی ہمت اور جراءت کی بات ہے اب آپ ہی غور فرمائیے کہ

صرف ہر ہندستانی ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے صاحبانِ بصیرت اِس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہندستان عدم تشدد کی قوت سے آزاد ہوا اور یہ کہ ہم نے اپنے جہادِ آزادی میں محض اہنسا سے کام لیکر کامیابی حاصل کی ہے لیکن اس کا کوئی علاج نہیں کہ ایک سیاسی مورخ اپنی جگہ سے اٹھتا ہے اور مائکروفون پر آکر ماضی بعید کی تاریخ کا تختہ الٹ کر رکھ دیتا ہے۔

خِرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خِرد

ایسے تمام محققین و سیاسئین و مورخین سے ہماری عظم برداشتہ گذارش ہے کہ وہ جب بھی بولیں پہلے اپنے خیالات کو ذہن میں تولیں اور پھر سامعین کے کانوں میں جھوٹی سچی باتوں کا رس گھولیں۔

سماجی

○

کل ہم نے اسی کالم میں ایک لطیفہ لکھا تھا کہ کس طرح ایک ڈاکٹر کی منگیتر کو ڈاکٹر کی مخصوص تحریر میں لکھا ہوا خط پڑھوانے کے لئے ایک کیمسٹ سے رجوع کرنا پڑا تھا۔
یہ لطیفہ پڑھکر ایک کرم فرما حکیم صاحب نے فرمایا کہ "دیکھا حکیموں کے یہاں یہ بدعت نہیں ہوتی کیونکہ یہ ہمیشہ نہایت واضح خط میں لکھا کرتے ہیں۔
حکیم صاحب کی اس خوش فہمی کے جواب میں یہ واقعہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کسی حکیم صاحب نے ایک مریض کو نسخہ لکھ دیا کہ وہ "گل بنفشہ ۵ دانہ الائچی" کا جوشاندہ استعمال کرے، اتفاق سے مریض نے یہ نسخہ ایک مولوی صاحب کو دکھلایا جو عامل بھی تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس نسخہ کو یوں پڑھا "گل بنفسہٗ دانہٗ اِلٰہی"۔
اور سات مرتبہ پڑھکر مریض پر پھونک دیا۔ اس سے پھر ایک بار یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی بھی تحریر کو پڑھنے یا خیالات کا اظہار کرنے میں ہر ایک کے اپنے مخصوص رجحانات ضرور کار فرما ہوتے ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب ایک روح فرسا خبر ایک چڑیمار کو سنائی گئی تو اس نے فوراً کہا کہ اس خبر کو سن کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، جب ایسی ہی خبر ایک کسان کو سنائی گئی تو اس نے کہا کہ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ جب ایک قصائی کو سنائی گئی تو اس نے کہا کہ میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ ایک لوہار کو سنائی گئی تو

دسرے نے کہا کہ میرا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ ایک کابل کو سنائی گئی تو کہا کہ میرا دل بیٹھ گیا ایک بزدل کو سنائی گئی تو کہا کہ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک سپیرے کو سنائی گئی تو کہا کہ میرے دل پر سانپ لوٹ گیا۔ ایک جراح کو سنائی گئی تو کہا کہ میرا وہ حال ہوا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ایک تیلی کو سنائی گئی تو کہا کہ میرا سر چکریں کھانے لگا۔ ایک ملاح کو سنائی گئی تو فرمانے لگے میرا دل ڈوبنے لگا۔ اور آخر میں جب حکیم صاحب کو سنائی گئی تو فرمانے لگے میری روح قبض ہو گئی۔

خیر جو کچھ ہوا ہمیں خوشی ہے کہ بات حکیم صاحب سے چلی تھی اور حکیم صاحب پر ختم ہوئی۔

۳۰ جولائی ۱۹۵۹ء

○

کل ہی ہم نے بات پر بات جوڑ کر یہ بتایا تھا کہ کسی روح فرسا خبر کے سننے پر مختلف رجحانات رکھنے والوں کے کیسے کیسے مختلف ردعمل ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر ایک بزرگ نے خواہش کی ہے کہ روح فرسا خبر کے بعد اگر خوشی کی خبر سے پیدا ہونے والے ردعمل کی بھی وضاحت کی جائے تو بات مکمل ہو جائے گی۔

ان بزرگ کی خواہش سر آنکھوں پر چنانچہ کہتے ہیں کہ ایک نہایت خوشی کی خبر سن کر شاعر نے کہا کہ دل کی کلی کھل گئی" ادیب نے کہا کہ زندگی میں بہار آ گئی" مصور نے کہا کہ گویا کسی نے شوخ رنگ گھول دیئے ہیں" مالی نے کہا کہ دل باغ باغ ہو گیا" خون کی کمی کے مریض نے کہا کہ چلو پھر خون بڑھ گیا روتی صورت نے کہا کہ مارے خوشی کے آنسو نکل گئے"۔ مسخرے نے کہا کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے" حال وقال کی محفل کے بزرگ نے کہا کہ جی لوٹ پوٹ ہو گیا" کبوتر باز نے کہا کہ دل لوٹن کبوتر بن گیا" پہلوان نے کہا کہ خوشی کے مارے چھاتی پھول گئی" اور ایک آتش باز نے کہا کہ "گویا اندھیرے میں پھلجھڑیاں چھوٹنے

لگیں۔ پھر آخر میں ہمارا ارشاد ہے کہ "فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست"۔

لیجیے "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" پر ایک اور واقعہ یاد آگیا کہتے ہیں کہ ایک شخص صبح دیر گئے تک سوتا پڑا تھا، ادھر سے ایک شرابی صاحب گذرے انھوں نے اس شخص کو دیر گئے تک سوتا دیکھ کر تنقید فرمائی کہ شاید رات بھر خوب پی ہے۔ اور اب سوتا پڑا ہے" ایک چور گذرا اس نے کہا "رات میں کہیں نقب لگائی ہوگی اور اب سونے کی فرصت ملی ہے" ایک جوے باز گذرا اس نے کہا رات بھر جوا کھیلا ہوگا اس لئے اب سوتا پڑا ہے" ایک گانے کے شوقین گذرے وہ کہنے لگے رات بھر مجرا سننے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ ایک مارواڑی گذرا وہ کہنے لگا رات بھر حساب کتاب جوڑتا ہوگا اب نیند لگ گئی ہے۔ ایک مزدور گذرا تو کہنے لگا۔ ناٹ شفٹ میں کام کیا ہوگا اس لئے تھکان میں نیند کا غلبہ ہوگیا' ایک عبادت گذار بزرگ گذرے اور کہنے لگے بیچارے نے رات بھر عبادت کی ہوگی اب ذرا نیند لگ گئی ہے' غرض جتنے منہ اتنی باتیں' لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ ضرور کوئی جرنلسٹ ہوگا' اور رات دیر گئے تک خبریں لیتا رہا۔

اگر آپ نے ان باتوں کو پڑھ کر قہقہہ لگایا ہے تو سنیئے آپ کے بارے میں بعض مشہور ہستیوں کی کیا رائے ہے۔ ڈکٹر ہیوگی نے کہا ہے۔ مجھے وہ قہقہہ پسند ہے جو ہونٹوں اور دل کو ایک ساتھ کھول دے" گولڈ اسمتھ نے کہا ہے بلند قہقہے کھوکھلے دماغ کی علامت ہیں۔ چسٹرفیلڈ نے کہا ہے "بار بار کے قہقہے بیوقوفی کی دلالت کرتے ہیں۔"

آخر میں ہمارا کہنا ہے کہ ان میں سے آپ کو جو پسند ہو اس میں سے منتخب کر لیجیے' باقی چھوڑ دیجیے۔

سنا ہے کہ ہمارے ملک میں عنقریب فحش کاری کے خلاف ایک زبردست مہم چلائی جانے والی ہے! فحش کاری کے خلاف مہم ضرور چلائی جانی چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر فحش نگاری کی روک تھام پر بھی توجہ دی جائے تو نہایت مناسب ہے۔ اس لیئے کہ بعض ماہرین نفسیات کی رائے میں فحش نگاری بھی فحش کاری پھیلانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے!

یہاں برسبیل تذکرہ یہ کہہ دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود ہمارے حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں فحش نگاری زوروں سے جاری ہے یعنی گندی کتابیں چھپتی ہیں پڑھی جاتی ہیں اور ان سے فحش کاری کو ترغیب ہوتی ہے۔

۳۱ر جولائی ۱۹۵۹ء

○

نوشتۂ دیوار کا پڑھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اور خاص کر موجودہ حالات میں جب کہ دیواریں کم ہیں اور نوشتے زیادہ ہیں یہ کام اور بھی مشکل ہو گیا ہے کہ اگر آپ کسی دن محض اس مقصد سے شہر کا چکر لگائیں کہ مختلف عزت مندوں نے مختلف دیواروں پر جو کچھ لکھ دیا ہے اس سے عبرت اور بصیرت حاصل کی جائے تو یقین کیجیئے کہ آپ کے پاؤں تھک جائیں گے سر میں شدید درد ہونے لگے گا لیکن دیواروں پر لکھی ہوئی تحریروں کا مطالعہ ختم ہونے میں نہیں آئے گا۔

مثال کے طور پر جب ہم گھر سے نکلے تو سامنے کی دیوار پر جلی حروف میں کبڈی کلب لکھا ہوا پایا اور قریب ہی یہ تحریر بھی نظر آئی کہ صالح معاشرہ قائم کرو۔ ابھی ہم کبڈی کلب اور صالح معاشرے کے ربط باہمی پر غور ہی کر رہے تھے کہ دائیں طرف دیوار پر یہ اعلان نظر آیا کہ یہاں جو شخص پیشاب کرے گا اس کو تو جوتے لگائے جائیں گے اور ٹھیک اس تحریر کے اوپر سرخ حروف میں درج تھا، سوشلسٹ پارٹی کو ووٹ

دیکھئے۔ کچھ دن پہلے تک ہمارے شہر کی دیواروں پر طلسمی ماتا کا بڑا زور و شور تھا۔ اب وہ صورت باقی نہیں رہی بلکہ اس کی جگہ مختلف نعروں نے لے لی ہے۔ مثال کے طور پر خیریت آباد کے قریب دیوار کی دیواریں اس احتجاج سے بھری ہوئی ہیں کہ۔

"ایک وزیر جو اس کے خاندان سے ہے اس کی مداخلت بند کرو۔" یہ معلوم کرنے کی لاکھ کوشش کیجئے کہ وہ وزیر کون ہے۔ کس کے خاندان سے ہے اور کس معاملے میں مداخلت کر رہا ہے کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ اس لئے کہ دیوار کی تحریر صرف ایک اشارہ ہوتی ہے۔ تفصیل نہیں ہوتی! کبھی صرف اس مقصد کو لیکر فرصت کے ساتھ گھر سے نکلئے تو دیواروں پر ایسی ایسی تحریریں آپ کی نظروں سے گذریں گی کہ آنکھیں کھل جائیں گی اور معلومات عامہ میں بے پناہ اضافہ ہو گا۔

یکم ستمبر ۱۹۵۹ء

⊙

دیواری نوشتوں کی طرح پوسٹروں اور اشتہاروں کا مطالعہ بھی کافی بصیرت افروز ہو سکتا ہے۔ اللہ کے فضل سے ہمارے شہر میں صنعتی تجارتی تہذیبی اور سیاسی ترقی بڑی تیزی سے ہو رہی ہے اور پروپگنڈہ کافی درجہ کمال کو پہونچ گیا ہے۔ چنانچہ پوسٹروں اور اشتہاروں سے دیواریں آراستہ ہیں اور بعض بعض جگہ تو یہ عالم ہے کہ پوری دیوار کاغذ کی معلوم ہوتی ہے۔ پوسٹروں کی کثرت سے بعض اوقات بڑی مضحکہ خیز صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر آپ کاچی گوڑہ کمان پر لگا ہوا ایک پوسٹر دیکھیں تو یہ یک نظر حیرت میں پڑ کر رہ جائیں گے اس پوسٹر کی عبارت یہ ہے "مسلمانوں کے بنیادی مسائل اسی وقت حل ہو سکتے ہیں جب کہ کیرالا میں مرکزی حکومت مداخلت نہ کرے" قریب جا کر غور کرنے سے یہ راز کھلتا ہے کہ دیوار پہ پہلے تعمیر ملت کا پوسٹر لگا ہوا تھا اس پر کسی اہل ذوق نے کمیونسٹ پارٹی کا پوسٹر چسپاں کر دیا ورنہ حقیقتاً مسلمانوں کے بنیادی مسائل کو کیرالا سے

کوئی تعلق نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ اگر کسی شخص کو فرصت ہو اور کوئی کام نہ ہو تو وہ شہر میں گھوم کر پوسٹر پڑھ کے مطالعہ سے کافی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

۳ر ستمبر ۱۹۵۹ء

○

کرنول میں دو آوارہ بیل آپس میں دست و گریباں ہو گئے حالانکہ بیل گریباں سے محروم ہوتے ہیں۔ اس گڑبڑ سے بعض شر پسندوں نے فائدہ اٹھایا اور لوٹ مار کی افواہ پھیلائی بہت دیر کے بعد پولیس مقام واردات پر پہونچی اور عوام کا اعتماد بحال کیا دو بیلوں کا وجود مختلف حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتا ہے ایک تو یہ کہ دو بیل کانگریس کی انتخابی علامت ہے۔ دوسرے یہ کہ پرانی درسی کتابوں میں دو بیلوں کے تعلق سے ایک بڑی سبق آموز کہانی ملتی ہے۔ یعنی کسی جنگل میں دو بیل رہتے تھے جب تک وہ متحد رہے کوئی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا لیکن جب وہ علٰحدہ ہو گئے تو شیر انھیں کھا گیا۔

یہ جنگلوں کے بیلوں کی کہانی تھی اور ظاہر ہے کہ شہر کے بیلوں کو اپنے جنگلی بھائیوں سے مختلف ہونا چاہیئے۔ چنانچہ کرنول میں جو آوارہ بیلوں نے ہنگامہ برپا کیا اس پر دوسری نوعیت کی کہانی لکھی جا سکتی ہے۔ جس میں یہ بتایا جا سکتا ہے کہ بیل جب آوارہ ہو جاتے ہیں تو شر پسند فائدہ اٹھا کر افواہیں اڑاتے ہیں۔ اور پھر پولیس کو اعتماد بحال کرنا پڑتا ہے!

ہدایات:۔ ایک مضمون لکھو جس میں بیلوں کی آوارگی کے نتائج بتاؤ۔؟

لوٹ مار کی افواہ پھیلانے والوں کو سزا تجویز کرو نیز یہ بتاؤ کہ بیلوں اور انسانوں میں کیا فرق ہے پولیس کی کارگذاری پر روشنی ڈالو۔؟

حسب ذیل الفاظ کے معنی لکھو۔

شر پسند، گڑبڑ، لوٹ مار، مقام واردات، اعتماد، بحال کیا

۵ر ستمبر ۱۹۵۹ء

ٹریفک کے جو نئے انتظامات ہمارے یہاں محکمہ متعلقہ کی طرف سے ہو رہے ہیں۔ اور رہبروں کو جو تربیت دی جارہی ہے وہ ہر حیثیت سے حوصلہ افزا اور لائق ستائش رہے ہیں ان تمام سرگرمیوں کا مقصد یہ ہے کہ راستہ چلنے والے آرام اور سکون کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہونچیں اور حادثے کم سے کم ہوں!

لیکن حادثوں سے بچنے اور بچانے کی اِس کوشش کے دوران میں جو واقعے ہوتے رہتے ہیں۔ وہ بھی اپنی جگہ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے اور ان سے بھی خاصی عبرت حاصل کی جاسکتی ہے راستہ چلنے والوں کی آسانی کے لئے شہر کی بعض سڑکوں کو ایک رُخی قرار دیا گیا ہے تاکہ لوگ ٹکر سے محفوظ رہیں اور خیریت کے ساتھ اپنے گھر پہونچ جائیں۔ لیکن چونکہ اس حکمت عملی کی کافی تشہیر نہیں کی گئی ہے۔ اِس لئے جو لوگ باہر سے آتے ہیں وہ ایک رُخی نہ دو رُخی" کے چکر میں پڑے بغیر ناک کی سیدھ میں چلے جاتے ہیں اور گھر پہونچنے کے بجائے پولیس اسٹیشن پہونچ جاتے ہیں!

پیدل چلنے والوں کے لئے اعلان کیا جاتا ہے کہ وہ فٹ پاتھ پر چلیں لیکن جب اس اعلان کے مطابق راستہ طے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فٹ پاتھ پر دہی بڑے، کلیجی کباب۔ جام، جامن اور خربوزے یا سائیکلیں موجود ہیں اور وہاں عوام الناس کے لئے پھونک پھونک کر قدم رکھنا بھی مشکل ہے۔

چند دن پہلے سڑکوں پر رکشاؤں اور موٹروں میں حدِ فاصل رکھنے کے لئے سفید نشانات ڈالے گئے تھے جو اب مرورِ ایام سے دھندلے پڑتے جارہے ہیں۔ اور اس طرح موٹر نشینوں اور رکشا میں بیٹھنے والوں کے درمیان جو مصنوعی لکیر کھینچی گئی تھی وہ ختم ہوتی جارہی ہے یعنی ہم سوشلزم کی طرف بڑھ رہے ہیں!

امید ہے کہ اربابِ متعلقہ اِس تھوڑے سے لکھنے کو بہت جانیں گے!!!

۶ ستمبر ۱۹۵۹ء

○

لیجئے انتظار کی صبر آزما گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ اور وہ روز سعید آکر گزر گیا۔ جس کا انتظار بڑی بے چینی سے کیا جا رہا تھا جس کے لئے اہلِ ذوق چشم براہ تھے یعنی ۸ ستمبر ۱۹۵۹ء کو دہلی میونسپل کارپوریشن کے سامنے پانچ سو گدھوں نے محصول جانوروں کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کر کے حاضرین و ناظرین کو حیرت میں ڈال دیا۔

یہ تو خیر ایک ایسا مسئلہ تھا جس میں گدھے ایک فریق کی حیثیت سے شریک تھے یعنی جانوروں پر جو محصول عاید کیا گیا ہے اس کی زد ان پر بھی پڑی تھی ہم تو اس سلسلہ میں اپنی یہ رائے بہت دن پہلے ہدیۂ قارئین کر چکے ہیں کہ ہمارے یہاں احتجاج اور مظاہروں کا کاروبار چونکہ بہت بڑھ چکا ہے اور دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے انسانوں کو اِس کاروبار میں حصہ لینے کی فرصت نہیں ہے اس لئے کیا ہی اچھا ہو اگر اسے کلیتاً گدھوں کے سپرد کر دیا جائے اور اس غرض کے لئے گدھوں کو باقاعدہ ٹریننگ دی جائے تاکہ وہ احتجاج اور مظاہرہ وغیرہ میں دلچسپی لیکر انسانوں کا ہاتھ بٹائیں اور نتیجتاً اپنی روزی میں اضافہ کا سبب بنیں!

افسوس ہے کہ گدھوں کے احتجاجی مظاہرہ کی یہ خبر واضح اور مفصل نہیں، کاش ہمیں یہ بھی بتایا جا سکتا کہ احتجاجی مظاہرہ میں حصہ لیتے وقت گدھوں کے چہروں پر کس قسم کے تاثرات تھے یعنی وہ بزدلوں کی طرح خوف محسوس کر رہے تھے یا شیروں کی طرح نڈر تھے! یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ مظاہرہ اور احتجاج کے وقت گدھے خاموش تھے یا ان کے ہونٹوں پر کوئی نعرہ بھی تھا۔ اگر نعرہ تھا تو اس کے الفاظ کیا تھے۔ اگر یہ نعرہ بے لفظ تھا تو اس کی آواز کس قسم کی تھی؟ جہاں تک ہم گدھوں کو سمجھ سکے ہیں اِس

بنا بریں یہ کہنا غلط نہیں ہو سکتا کہ احتجاجی مظاہرہ کرتے وقت گدھوں نے دہلی کو یا کم سے کم دہلی کارپوریشن کو سر پہ اٹھا لیا ہوگا۔

بہرحال اب وقت آگیا ہے کہ ملک کے گدھے بھی فرض شناسی سے کام لیں اور معروف انسانوں کو یہ کہنے کا موقع عنایت کریں کہ

"عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھوں پہ ڈالا جو بار اپنا"

۱۰ ستمبر ۱۹۵۹ء

○

مغربی جرمنی کے ایک سابق مڈیکل آفیسر نے کھٹملوں کی ایک بے نظیر اور نادر نمائش منعقد کی ہے۔ اس نمائش میں کھٹملوں کی (۵۶۳) نسلوں سے پیدا شدہ (۱۴۵۷) قسموں کے کھٹمل رکھے گئے ہیں۔ انسانی زندگی میں نمائش کی تاریخ بہت قدیم ہے۔

یعنی جب سے انسان عالم وجود میں آیا ہے مختلف قسم کی نمائشیں کرنے میں مصروف ہے، ہتھیاروں کی نمائش، کپڑوں کی نمائش، میووں کی نمائش، زراعت کی نمائش، جانوروں کی نمائش یہاں تک کہ اب وہ ترقی کے مراحل طے کرتا ہوا کھٹملوں کی نمائش تک پہونچ گیا ہے اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہوگا۔

انسان کے دشمنوں میں کھٹمل کو اہم درجہ حاصل ہے مچھر بھی تقریباً اسی درجہ پر فائز ہیں۔ لہٰذا ہماری تجویز یہ ہے کہ جس طرح مغربی جرمنی کی ایک معزز شخصیت نے کھٹملوں کی نمائش پر توجہ کی ہے اب کوئی اہل ذوق مچھروں کی نمائش پر توجہ کرے۔

جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے ہم زیادہ سے زیادہ چوہوں کی نمائش کر سکتے ہیں اس لئے کہ نہ صرف چوہے طاعون پھیلاتے ہیں بلکہ انسانوں کے حصہ کا غلہ بھی کھا جاتے ہیں اب ان حرام خوروں نے شکر بھی کھانا شروع کر دی ہے۔

اور یہ خبر بھی جرمنی ہی کی ہے کہ وہاں ایک ہندستانی انجنیر نے برلن کی آزادی کے لئے بھوک ہڑتال شروع کر دی ہے۔ ان کا ارادہ ہے کہ مشرقی اور مغربی برلن کی سرحد پہ ایک خیمہ لگائیں اور اس میں بھوک ہڑتال کا سلسلہ جاری رکھیں! کتنی مسرت کی بات ہے کہ بھوک ہڑتال کا طریقہ جو خالصتاً ہندستانی تھا اب دوسرے ممالک میں آزمایا جا رہا ہے ہم لوگ اس بات پر فخر کر سکتے ہیں اور اس ہندستانی انجنیر کی پیٹھ ٹھونک کر کہہ سکتے ہیں کہ

واہ' واہ شاباش لڑکے واہ' واہ

محض خلوص اور ہم وطنی کی بنا ء پر گذارش ہے کہ مشرقی اور مغربی جرمنی کی سرحد پہ جس خیمہ میں یہ صاحب بھوک ہڑتال کا کرشمہ دکھانے والے ہیں اس میں کچھ سامان خورد ونوش بھی موجود رہنا چاہیئے تاکہ جب یہ بھوک ہڑتال ختم ہو تو موصوف کو تکلیف نہ ہونے پائے۔

علی گڑھ میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کا چوتھا اجلاس منعقد ہونے والا ہے اس سلسلے میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوگا!

ایسی خبروں سے "مشاعروں" کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے' اور معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک نے کتنی ترقی کر لی ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ کانفرنس سے لے کر "ختنہ" تک کوئی تقریب ایسی نہیں ہوئی جس کا اختتام مشاعرے پر نہ ہو' اور اگر حالات یہی رہے تو کچھ دن بعد پورا ملک "آل انڈیا مشاعرہ" بن کر رہ جائیگا۔

۶/اکتوبر ۱۹۵۹ء

○

جبل پور میں ایک شیر نے بکری پہ حملہ کر دیا' بکری ایک کنوئیں کے قریب کھڑی ہوگئی اور جب شیر نے اس پر جست لگائی تو وہ کنوئیں میں جا گری۔

لہذا ملک کے تمام شیروں سے گذارش ہے کہ جب وہ کسی بکری پر حملہ کرنا چاہیں تو پہلے اس بات کا تیقن حاصل کرلیں کہ وہ کسی کنوئیں کے قریب تو کھڑی ہوئی نہیں ہے۔

لاہور کے مولٰنا فضل حسین دلاور کو اپنی شادی کے وقت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا یعنی موصوف کے ہونے والے خسر نے صاف صاف کہدیا کہ اگر آپ سیاست میں حصّہ لیں گے تو میں اپنی لڑکی کی شادی آپ سے نہیں کرسکتا آخر دلاور صاحب نے ایک توبہ نامہ لکھ کر دیا!

دلاوری کی بات تو جب تھی کہ آپ بھی اپنے خسر سے صاف صاف کہہ دیتے کہ میں سیاست میں حصّہ بھی لونگا اور شادی بھی کرونگا۔

موجودہ صورت میں موصوف کے متعلق صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ ؎

"برعکس نہند نام زنگی کافور" !!

۹ اکتوبر ۱۹۵۹ء

○

اُردو زبان میں آیا ہے "میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی" یعنی اگر عورت مرد تیار ہوں تو قاضی کی بھی ضرورت نہیں اگر کسی شخص کے خیال میں یہ مفہوم شرعی نقطۂ نظر سے غلط ہو تو یہ یوں سمجھ سکتا ہے کہ اگر ایک عورت اور ایک مرد شادی کرنے پر آمادہ ہوں تو قاضی شہر بھی انھیں روک نہیں سکتا بالکل اسی طرح اگر عورت اور مرد میاں بیوی کی طرح ساتھ نہ رہنا چاہیں تو انھیں طلاق لینے سے اور علٰحدہ ہوجانے سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا اور یہ محض ایک اتفاق ہے کہ طلاق کی واردا تیں آج کل امریکہ میں بہت ہورہی ہیں!

اور جب "واردا تیں" زیادہ ہوتی ہیں تو ان کے اسباب بھی مختلف ہوتے ہیں مثال کے طور پر حال ہی میں ایک شخص نے اس بنا پر اپنی بیوی سے طلاق حاصل کی ہے کہ جب وہ سورہا تھا تو بیوی نے اس کے گنجے سر پر پالش کی شیشی انڈیل دی تھی!

اسی طرح چند دن پہلے ایک بیوی نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی اور وجہ یہ بتلائی کہ وہ سونے میں غراٹے بہت لیتا ہے اس کے علاوہ اسے نیند بھی بہت آتی ہے یعنی یہ کہ وہ کھانا کھاتے وقت، کھانا کھاتے وقت یہاں تک کہ محبت کی باتیں کرتے وقت بھی سو جاتا ہے گویا سہ

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ۔۔۔ ہم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

نیویارک میں ایک اور طلاق ہوئی اور یادگار حیثیت اختیار کر گئی ایک فریق یعنی بیوی کا بیان تھا کہ اس کا شوہر بجائے اس کی تعریف کرنے کے دوسری عورتوں کے مدح سرائی کرتا رہتا ہے چنانچہ عدالت نے درخواست منظور کر لی اور شوہر کو عورت کی شان میں قصیدہ کہنے کے لئے آزاد کر دیا !

جبلپور میں تمباکو کے ایک گودام کو آگ لگ گئی اور ۵ ، ہزار روپے کا تمباکو جل گیا۔ افسوس صد افسوس تمباکو کی اس گرانی کے زمانے میں اگر قرب و جوار کے حقہ پینے والوں کو اس حادثہ کا پہلے سے علم ہو جاتا ہے تو وہ موقعہ واردات پر پہونچ جاتے اور تمباکو میں لگی ہوئی آگ کے دھوئیں کو بہ صد شوق پیتے رہتے ۔

۱۰ اکتوبر ۱۹۵۹ء

○

پولیس نے ایک شوہر کو اپنی نویلی بیوی کا قیمتی نکلس چرانے کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے ہمیں اس شخص کے ساتھ پوری پوری ہمدردی ہے کہ پہلے تو بیوی صاحبہ گلے کا ہار بن کر تشریف لائیں اور اب ان کا قیمتی ہار اس بیچارے کے گلے کا ہار بننے پر تل گیا ہے ۔

شاید آپ کو بھی معلوم ہو کہ ہمارے یہاں دوسرے محکموں کے ساتھ ایک محکمہ انسداد رشوت ستانی بھی ہے ! اور ہم اس وقت کے منتظر ہیں جب ملک میں محکمہ انسداد بچھو،

محکمۂ انسدادِ مچھر، محکمۂ انسدادِ کھٹمل جیسے اہم اور ضروری محکمے بھی قائم ہو جائیں گے اور مخلوقِ خدا کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچائیں گے۔

شری کروشچوف نے کہا ہے کہ تخفیفِ اسلحہ کے ذریعہ جنگ کو ناممکن بنایا جا سکتا ہے۔
جنگ کو ناممکن بنانے کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ لوگوں کے دماغوں کی تخفیف کی جائے، ہمارا مطلب یہ ہے کہ دماغ درست کیے جائیں۔

ہوڑہ میں جو پولیس فائرنگ ہوئی تھی اس کی تحقیقات ہونے والی ہے۔
ہماری رائے میں گھوڑے کے آگے گاڑی' اس کو کہتے ہیں' یعنی یہ کہ اگر فائرنگ سے پہلے ہی تحقیقات کر لی جائے تو کیا حرج ہے۔

خبر آئی ہے کہ لندن میں ایک شخص پرندہ کی طرح اڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ شخص زمین سے بیس فٹ اڑتا رہا!
دیکھنا چاہیے کہ لندن کے پرندوں پر اس خبر کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے!!

شری ہمایوں کبیر نے فرمایا اردو کے ہر ادیب کو چاہیے کہ وہ کم سے کم ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کرے۔
اردو کے ادیبوں کی طرف سے ہم فی الحال اپنی خدمات پیش کرتے ہیں' ترجمہ کی اجرت فی صفحہ صرف دو روپے سکۂ ہند مقرر ہے' باقی شرائط بالمشافہ طے کی جا سکتی ہے!
یا بذریعہ ٹھپہ

کلکتہ کے ایک ڈاکٹر صاحب نے بعد تحقیق انکشاف کیا ہے کہ لپ اسٹک کا استعمال صحت کیلئے انتہائی مضر ہے" مگر سوال یہ ہے کہ کون سی سادہ لوح " بقائے صحت کیلئے لپ اسٹک کا استعمال کرتی ہے !

ایک ایسا سارق گرفتار ہوا ہے جو ہوٹلوں میں چوری کیا کرتا تھا مال مسروقہ بھی برآمد کر لیا گیا ہے !
حالانکہ عام اندازے کے مطابق ہوٹلوں کا "مال مسروقہ" بہت جلد ہضم ہو جانا چاہیئے !!!

بنگلور میں ایک شاعر کو شاعر کرناٹک کا خطاب دیا گیا ہے !!
امید ہے کہ خطاب دینے والوں کی اس حرکت سے کنڑی شاعری کو خوب فروغ حاصل ہوگا ۔

آخر میں ایک لطیفہ یہ ہے کہ مجروح سلطان پوری کی قیام گاہ پر پہونچ کر ایک ادب نواز صاحب نے دریافت فرمایا کہ سلطان مجروح پوری کہاں ٹھیرے ہوئے ہیں ۔ !

۱۲ نومبر ۱۹۵۹ء

○

احمد آباد کا ایک درزی دن رات محنت کر کے پریسیڈنٹ آئزن ہوور کے لئے ایک تحفہ تیار کر رہا ہے یہ ایک حسینہ کی تصویر ہے جو کپڑے پر زر بفت کے تاروں سے بنائی جا رہی ہے ۔
اسے بھائی درزی تم سب مہذب انسانوں کے محسن ہو، ننگوں کا جسم ڈھانکتے ہو! اور حلال کی کمائی پہ بسر کرتے ہو، مگر بیٹھے بٹھائے تمہارے جی میں یہ کیا آئی کہ پریسیڈنٹ آئزن ہوور کیلئے زر بفت کے تاروں سے ایک حسینہ کی تصویر بنانے لگے ۔ موصوف بوڑھے

آدمی ہیں اندر اپنی زندگی فوج میں گذار چکے ہیں !

اِس سے بہتر تو یہ تھا کہ تم رات دن محنت کر کے پریسیڈنٹ موصوف کے لئے کوئی اچھا سا یونیفارم پہناتے اور منہ مانگا انعام پاتے ۔

لندن میں خواتین کے لئے کاغذ کے لباس تیار کئے جانے والے ہیں جنھیں وہ ایک بار پہننے کے بعد اتار کر پھینک دیا کریں گی !

اب پتہ چلا کہ غالب نے یہ مصرعہ کس وقت کے لئے کہا تھا ؎

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

جہاں تک ہمارے اِن دوستوں کے بیانات کا تعلق ہے جو لندن سے واپس آئے ہیں وہاں کی خواتین بالکل پیکرِ تصویر ہوتی ہیں ۔

ایک پروفیسر صاحب کا ارشاد ہے کہ ادیبوں کو امداد باہمی کے نظریہ کا پرچار کرنا چاہیئے ۔ اس نظریہ کو عملی شکل دینے کے لئے مناسب یہ ہے کہ ادیب اور امداد باہمی کا بنیادوں پر غلہ کی دوکانیں کھول لیں ۔

چین کے ایک اخبار نے صدر امریکہ مسٹر آئزن ہوور کے دورہ ہند کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندستان ایک بڑی مچھلی ہے اور صدر امریکہ اسے بہت دن سے شکار کرنا چاہتے ہیں ۔

اِس اخبار کی عام معلومات میں اضافہ کرنے کی فرض سے عرض ہے کہ ہندستان مچھلی ہرگز نہیں ہے ۔ کوئی دوسرا آبی یا ارضی جانور بھی نہیں ہے ۔ جس کے شکار کا کوئی سوال پیدا ہو۔ وہ تو ایک ملک ہے جس میں انسان رہتے ہیں اور خود ان انسانوں میں سے بے شمار لوگ سیر و شکار کا شوق رکھتے ہیں ! —

۱۳ رنومبر ۱۹۵۹ء

○

اے جانے والے اپنے پیچھے دیکھتا ہوا چل۔ کیونکہ تو سامنے تو ویسے بھی دیکھ رہا ہے۔

نکتہ اِس قول میں یہ ہے کہ جب انسان چلتا ہے تو ہمیشہ اپنے سامنے دیکھتا ہے۔ حالانکہ زیادہ تر ضرورت اِس امر کی ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیچھے دیکھے تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ پیچھے سے بس آسے کچلنے کے لئے آرہی ہے یا کوئی شخص آستین میں خنجر چھپائے اس کے قدم پر قدم رکھتا چلا آرہا ہے یا اس کی پھٹی ہوئی جیب میں سے سگریٹ کی ڈبیا گر پڑی ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر پیچھے دیکھ کر چلنے میں کوئی مشکل بھی نہیں ہے کیونکہ آگے تو انسان دیکھتا ہی ہے آگے نہ دیکھے تو آگے جائے کیسے پیچھے بھی دیکھے گا تو آگے بھی دیکھتا رہے گا۔

۱۹ نومبر ۱۹۵۹ء

○

جب اعداد و شمار جمع کئے گئے تو پتہ چلا کہ ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں مردوں کی تعداد عورتوں سے پچاس لاکھ زیادہ ہے۔ اس انکشاف سے ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اگر پاکستان مستقبل قریب میں پچاس لاکھ مرد پیدا نہیں کرتا تو اسے بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سلسلے میں صرف ایک تعدد ازدواج کا سہارا تھا سو وہ بھی پاکستانی حکومت نے چھین لیا ہے اور صاف صاف کہہ دیا ہے کہ کوئی پاکستانی مرد ایک سے زیادہ شادی نہیں کر سکتا ہے۔ گویا ؎

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا!

یا بہ زبان فارسی ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

یہ تصویر کا ایک رخ تھا جس پر زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ

وہ ہمارے پڑوسی ملک کا داخلی معاملہ ہے لیکن تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ جس پر بہت زیادہ روشنی پڑ سکتی ہے اس لئے کہ وہ معاملات خارجی سے تعلق رکھتا ہے یعنی پاکستانی حکومت نے حکم دیا ہے کہ کوئی پاکستانی باشندہ (بلا قید صنف) کسی غیر ملکی باشندے سے شادی نہ کرے اور اس حکم کے "حلقۂ اثر" میں ہندستان بھی شامل ہے جو اب ایک الگ ملک بن گیا تو کیا ہوا کچھ دن پہلے تک تو جو علاقہ پاکستان کہلاتا ہے ہندستان ہی کا ایک حصہ تھا، اس دعوے کا ثبوت ایک طرف تو تاریخ سے ملتا ہے دوسری جانب سماجی بلکہ ازدواجی تعلقات بھی اس کے گواہ ہیں یعنی اس وقت تک صورت حال یہ ہے کہ اگر شوہر صاحب ہندستان میں تشریف رکھتے ہیں تو بیوی صاحبہ پاکستان میں رونق افروز ہیں اور محض خط وکتابت کے ذریعہ زندگی بسر ہو رہی ہے۔

اب جو یہ نیا حکم شرف صدور لایا ہے تو یقیناً حالات بہتر ہو جائیں گے، میاں بیوی کے درمیان جو فاصلہ حائل ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جیسا کہ اقبال نے کہا ؎

آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک

۱۷ مارچ ۱۹۶۱ء

○

ان تمام قارئین کی خدمت میں عید مبارک جو خود اس کالم کو شوق سے پڑھتے ہیں اور دوسروں کو بھی شوق سے پڑھنے پر آمادہ کرتے رہتے ہیں!

یہ سطور لکھنے کے بعد غور جو کیا تو پتہ چلا کہ بات "من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو" والی ہوگئی یعنی جو لوگ شیشہ بہ تیشہ شوق سے پڑھتے ہیں صرف وہی کوکن کی نگاہ میں "مبارک باد" کے مستحق ہیں دوسرے چاہے عید منائیں، یا گھر میں پڑے ہوئے سوتے رہیں اسے کوئی دلچسپی نہیں! اس ممکنہ غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے خاکسار کوکن مبارکباد کے سلسلے کو طویل کرنا مناسب سمجھتا ہے لہذا عرض ہے کہ

ان سب دوستوں کو عید مبارک جو یہ کالم بالکل پسند نہیں کرتے بلکہ ان کے بجائے کوئی جاسوسی ناول پڑھنا بہتر سمجھتے ہیں!

اُن تمام اہلِ ایمان حضرات کو عید مبارک جنھوں نے پورے روزے رکھے اور سحرو افطار کی پابندی کو بھی ملحوظ رکھا!

اُن اربابِ خِرد کو عید مبارک جنھوں نے روزے تو بالکل نہیں رکھے اور سحرو افطار کی حاضری کو ضروری سمجھا!

ان لوگوں کی خدمت میں عید مبارک جو بڑی وضعداری کے ساتھ عیدگاہ جاتے ہیں اور واپسی میں بچوں کے لئے کھلونے خریدنا نہیں بھولتے!

ان بھائیوں کو عید مبارک جو عید کی نماز بھی نہیں پڑھتے لیکن اپنی صورت نمازیوں جیسی بنالیتے ہیں۔

ان بہنوں کو عید مبارک جنھوں نے آج نئی ساڑھی پہننی ضروری سمجھی اور اپنے شوہر کی آدھی تنخواہ اس پر صرف کرڈالی!

ان ماؤں بہنوں بیٹوں کو بھی عید مبارک جو حالاتِ زمانہ سے مجبور ہو کر آج بھی سالِ گذشتہ کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔

ان بچوں کو عید مبارک جو عید کی نماز کے دوران میں صفوں کے اندر گھس جاتے ہیں اور نمازیوں کے خشوع و خضوع کو متاثر کرتے ہیں۔

ان شاعروں کو عید مبارک جو آج کا پورا دن مختلف ہوٹلوں میں بیٹھ بیٹھ کر گذار دیں گے اور بار بار فرمائیں گے کہ ہمارے سوا دنیا بھر میں کوئی اور شاعر نہیں ہے!

ان ہوٹل والوں کو عید مبارک جو آج دودھ میں پانی زیادہ ملاتے ہیں اور بھینسوں کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ نہایت ہی خراب دودھ دینے لگی ہیں!

ان بے فکروں کو بھی عید مبارک جو ہر روز سڑکوں پر مارے مارے پھرتے ہیں

اور اپنے اعمالِ قبیحہ کی وجہ سے سڑک چھاپ فرہاد کا لقب حاصل کرتے ہیں۔

ان شوقینوں کو عید مبارک جو آج کے دن سنیما دیکھنا انتہائی ضروری سمجھتے ہیں اور اگر کسی وجہ سے اپنا شوق نہ پورا کرسکے تو ایسا محسوس کرتے ہیں گویا عید آئی ہی نہیں!

ان خوش خوراک حضرات کو بھی عید مبارک جو تہوار وغیرہ کے موقعہ پر زیادہ کھا جاتے ہیں اور نتیجتاً سوئے ہضم کی تکلیف برداشت کرتے ہیں!

ان برخورداروں کو عید مبارک جو اپنے بڑوں سے تو عیدی وصول کرلیتے ہیں۔ لیکن اپنے چھوٹوں کو ایک کوڑی بھی نہیں دیتے۔

ان خوش مذاق حضرات کو عید مبارک جو آج شکیلہ بانو بھوپالی کی قوالی سنیں گے!

اور آخر میں خود کو بھی کو عید مبارک جسے اپنے منہ میاں مٹھو بننا کہا جاتا ہے۔

۱۹ر مارچ ۱۹۶۱ء

○

اردو زبان کی تاریخ پڑھیئے تو پتہ چلے گا کہ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے، جب ہمارے یہاں خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے اور ہندستان کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے ملک میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب نورجہاں نے اپنے ہاتھوں سے کبوتر اڑا دیئے تھے اور جہانگیر کا دل جیت لیا تھا!

کبوتر اڑانا یوں بھی ہمارے ملک کا ایک فنِ خصوصی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں بڑی مسرت ہوئی جب معلوم ہوا کہ جاپان کے اخبارات اب بھی کبوتروں سے خبر رسانی کا کام لیتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ باریک کاغذ پر لکھی ہوئی خبر کبوتر کے پر سے باندھ دی جاتی ہے اور پھر وہ سدھا ہوا کبوتر اسے لیکر منزلِ مقصود تک پہونچ جاتا ہے، لیکن کبھی کبھی کوئی فنی غلطی ہو جاتی ہے تو نتیجہ حسب مرضی نہیں نکلتا ہے ؎

جس میں نامہ بندھا تھا دلبر کا ٭ وہی پر گر گیا کبوتر کا!

جس زمانے میں لوگ واقعی عشق کرتے تھے۔ اور پردے کا رواج بہت شدید تھا اس وقت بھی کبوتروں سے یہی کام لیا جاتا تھا خیر تھوڑا بہت عشق تو آج بھی ہوتا ہے لیکن بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے اب کبوتر کی ضرورت باقی نہیں رہی یہ کام ٹیلیفون سے لیا جاتا ہے اور حق یہ ہے کہ ٹیلیفون کبوتر کے مقابلہ میں زیادہ اطمینان بخش ہے۔!

بات اصل میں جاپان کی تھی اور وہ عشق سے ہوتی ہوئی ٹیلیفون تک پہونچ گئی، ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ جاپان کے بعض اخبارات میں ٹیلی پرنٹر کی جگہ کبوتروں کی چھتریاں بنی ہوئی ہیں، یہ پیامات وغیرہ لیکر آتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسی مفید مخلوق کے لئے قیام و طعام کا معقول انتظام لازماً ہوگا!

کیا حرج ہے اگر ہمارے یہاں بھی اسی قسم کی کوئی تدبیر کی جائے، یعنی اخبارات کبوتروں کو ایک ذریعہ خبر رسانی کے طور پر استعمال کریں اس طرح چونکہ اخراجات کم ہوں گے، اس لئے کاغذ کی گرانی سے جو نقصان پہونچ رہا ہے اس کی تلافی ہو سکتی ہے!

سلطان پور سے خبر آئی ہے کہ وہاں میونسپل بورڈ نے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر پابندی عاید کر دی ہے!

گو میونسپل بورڈ کی مصلحت ہم نہیں جان سکتے لیکن اس فیصلہ کی مخالفت کرنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر یہ پابندی برقرار رہی تو مجروح سلطانپوری خود اپنے وطن میں اپنی غزلیں عوام کو نہیں سنا سکیں گے!

ایک حیثیت سے یہ پابندی بالکل لاحاصل ہے۔ ہم نے ایسے بلند آواز حضرات بھی دیکھے ہیں جو لاؤڈ اسپیکر کے بغیر اپنی آواز کو کئی کئی میل دور پہونچا سکتے ہیں، اور الکشن وغیرہ کے مواقع پر کامیابی حاصل کرتے ہیں!

تہری پورہ میں عورتوں کی پولیس تیار کی جارہی ہے!

بہت مناسب ہے صرف اس سوال کا جواب مل جانا چاہیئے کہ یہ پولیس صرف عورتوں ہی کے معاملات میں مداخلت کرے گی یا مردوں کے قضیئے بھی قابلِ دست اندازی سمجھے جاسکیں گے؟

۲۴ر مارچ ۱۹۶۱ء

○

شاعر نے یوں کہا ہے ؎

آدمی کے ہاتھوں سے آدمی کو موت آئے

اِس سے بڑھ کر کیا ہوگی زندگی کی رسوائی

لیکن انسانی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو کبھی کبھی اس صفائی کے ساتھ مار دیتا ہے کہ کوئی درندہ کسی دوسرے درندہ کو نہیں مار سکتا یعنی حد ہوگئی کہ اب تک کسی شیر نے دوسرے شیر کو ہلاک نہیں کیا' یا ایک ریچھ نے دوسرے ریچھ کا گلا نہیں گھونٹا' حتیٰ کہ بھیڑیئے بھی دوسرے بھیڑیوں کو اسی وقت کھاتے ہیں جب انھیں شدید بھوک ہو اور کھانے کیلئے کوئی "حلال" چیز موجود نہ ہو۔ لیکن ایک قوم حضرت انسان کی ہے جو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہتی ہے اور ادھر کئی ہزار برس سے مہذب ہونے کی بھی مدعی ہے اس کی نسبت روزآنہ خبریں آتی رہتی ہیں کہ کسی اشرف المخلوقات نے دوسرے اشرف المخلوقات کو موت کے گھاٹ اتار دیا یا یہ کہ کسی انسان نے دوسرے انسان کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا کہ فریقِ ثانی دوسری دنیا میں تشریف لے گیا۔ گویا شرف و تہذیب کے ایک معنی یہ بھی ہیں!

انسان کا حال اس وقت اور بھی افسوسناک ہو جاتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ کسی نے اپنے بھائی کی زندگی چھین لی' عہدِ قدیم (ترین) میں ایک واقعہ ایسا ملتا ہے۔

جسکی تفصیلات یہ ہیں کہ ہابیل نے قابیل کو جان سے مار دیا یا شاید قابیل نے ہابیل کو ختم کر دیا۔ ہیں یہ دونوں آپس میں بھائی بھائی! اوراق پارینہ گواہ ہیں کہ ان کے درمیان ایک لڑکی وجہ نزاع بنی ہوئی تھی!

ابھی ہم اس پرانے واقعہ پر افسوس کر ہی رہے تھے کہ بلند شہر سے بھی ایک خبر آگئی اس خبر کی تفصیلات بھی کافی عبرت انگیز اور سبق آموز ہیں یعنی بتایا گیا ہے کہ جب ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو آدھی روٹی دینے سے انکار کر دیا تو روٹی مانگنے والے بھائی نے روٹی نہ دینے والے بھائی کے سینہ میں چاقو کا دستہ اتار دیا معلوم نہیں بھائی کو اللہ میاں کے پاس بھیج کر دوسرے بھائی نے وہ آدھی روٹی کھائی یا اس سے پہلے ہی پولیس اسے پکڑ کر حوالات کی طرف لے گئی ایسی خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ انسان نے اوپر سے تو کافی ترقی کر لی ہے لیکن اندر سے وہ ابھی تک لاکھوں برس پہلے کی پسماندہ زندگی گذار رہا ہے۔

وقفہ سوالات :- ایک بھائی دوسرے بھائی کا دشمن کیوں ہو جاتا ہے؟ نقصان میں کون رہا۔ وہ بھائی جس نے روٹی مانگی تھی۔ یا وہ جس نے روٹی دینے سے انکار کر دیا۔
انسان اگر اسی طرح دوسرے انسانوں پہ حملے کرتا رہا تو اس کا کیا حشر ہوگا؟ مفصل لکھو!!!

جزیرہ فارموسا امریکی حکومت کے زیر اثر ہے اور اس میں آج کل ایسے حیرت انگیز واقعات ہو رہے ہیں جو ہمارے یہاں کے بھانامتی سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً ایک دن لوگوں نے کیا دیکھا کہ زمین پر بے شمار ڈالر نوٹوں کی شکل میں بکھرے پڑے ہیں اور فقراء و مساکین ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔ تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ ایک شخص اپنی محبوبہ سے مایوس ہو گیا تھا اور غم فراق میں اپنی ساری دولت اس طرح ضائع کر دینا

چاہتا تھا۔
کاش ہمارے یہاں بھی اسی ٹائپ کے دولتمند ناکام عاشق پیدا ہوگئے تو ان کے وجود سے بہتوں کا بھلا ہوگا!

عشق کا ذکر آیا ہے تو بڑا دلچسپ یہ واقعہ بھی سن رکھیئے کہ جب ایک لڑکی کی شادی اس نوجوان سے ہوئی جو اس سے محبت کرتا تھا تو عین شادی کے دن انکشاف ہوا کہ لڑکی جنسی تبدیلی کی وجہ سے مرد بن گئی ہے!
یہاں قدرت نے ایک ہاتھ سے تالی بجانے کی کوشش کی ہے ورنہ اگر وہ اسی مدت مقررہ میں نوجوان کو لڑکی بنا دیتی تو کسی کے لئے کوئی وجہ شکایت پیدا نہ ہونے پاتی!
من تو شدم تو من شدی

۲۵ مارچ ۱۹۶۱ء

⊙

آج یکم جولائی ہے (یکم اپریل نہیں ہے کہ آپ مذاق سمجھیں) اور دوسرے علاقوں کی طرح ہمارے آندھرا پردیش میں بھی "مکھی مار ہفتہ" شروع ہو رہا ہے۔ اس ہفتہ میں مکھیوں کو مارنے کی مہم بڑے پیمانے پر چلائی جائے گی اور عوام کو مکھی کے مضر اثرات سے آگاہ کیا جائیگا۔
ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب ہوا' ہمارا مطلب یہ ہے کہ مکھی روز ازل سے انسان کو مارتی چلی آئی ہے' مگر آج سے انسان مکھی کو مار رہا ہے اور اپنے اس حریف سے انتقام لے رہا ہے' خدا کرے یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے یعنی انسان مکھی کو مارتا رہے' مکھی انسان کو ہلاک نہ کر سکے۔

تاریخ عالم کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے' اور

خلیفۃ اللہ ہے اور دانائے راز ہے اور فاتح اعظم ہے، مکھی کی وجہ سے ہمیشہ پریشان رہا ہے، بلکہ مکھی کو ہلاک کرنے کے لئے اسے باقاعدہ ہفتہ منانا پڑتا ہے، چنانچہ شاید ایک مکھی سے بیزار ہو کر استاد شاہ نے کسی موقع پر فرمایا تھا ؂

اے بے بسی یہ ذوقِ بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

مکھی سے انسان کی بیزاری بہت قدیم ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے شعراء نے تمام حشرات الارض وطیور کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے لیکن مکھی کو منہ نہیں لگایا، صرف شاہ نصیر نے ایک غزل مکھی مار کی ردیف میں لکھی تھی، لیکن اس پر بھی وہ لے دے ہوئی کہ دہلی چھوڑ کر حیدرآباد آنا پڑا!

اب سے ہم مکھی مارنے کے لئے اپنی عمر عزیز کا پورا ایک ہفتہ وقف کرچکے ہیں، ہمیں اس مہم کو پورے خلوص اور پوری سرگرمی سے چلانا چاہیئے اور ایک باقاعدہ منصوبہ بنا کر پروگرام کو آگے بڑھانا چاہیئے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ ہم مکھی کو اپنا دشمن نمبر ایک "ڈکلیئر" کردیں۔ اور صاف صاف کہہ دیں کہ فی الوقت ہندستانیوں کو کسی سے خطرہ نہیں ہے۔ سوائے مکھی کے، اس کے بعد مکھی کو ہلاک کرنے کی جدوجہد اس طرح شروع کی جائے کہ تھوڑے دن بعد مکھی کی نسل ہی ختم ہو جائے، یہ کوشش اجتماعی طور پر ہونی چاہیئے۔ یعنی ہر شخص چاہے وہ بیٹھا ہوا ہو، کھڑا ہوا ہو، یا پلنگ پر لیٹا ہوا ہو، مکھی مارنا اپنا اولین فرض سمجھے اور جو شخص یہ ثابت کرسکے کہ اس نے بلا شرکتِ غیرے تیس مکھیاں ماری ہیں اسے تیس مار خاں کا خطاب دیا جائے!

معظم جاہی مارکٹ سے جو سڑک ترپ بازار جاتی ہے، اس پر ۵ فٹ گہرے گڑھے پڑتے ہوئے ہیں اور بعض جگہ مٹی کے ٹیلے بن گئے ہیں۔

تاکہ آنے جانے والوں کو زندگی کے نشیب و فراز کا علم ہو سکے!!!

یکم جولائی سنہ ۱۹۶۱ء

O

انسان بھی ایک قسم کا حیوان ہے، چنانچہ منطق کی پرانی کتابوں میں اسے "حیوان ناطق" کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور انسان اپنی اس "پوزیشن" پر فخر بھی کرتا ہے، چنانچہ ڈارون صاحب نے تو شوقِ حیوانیت میں یہ دعویٰ بھی کر دیا کہ انسان کے آبا و اجداد ابتدا میں بندر تھے پھر گردشِ ایام کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی دم جھڑ گئی، قد سیدھا ہو گیا، چہرے کی ساخت بدلی، بال کم ہوئے، یہاں تک کہ وہ موجودہ "حلیہ" میں آکر اشرف المخلوقات کہلائے۔

اس موضوع پر طویل بات چیت ہو سکتی ہے لیکن آج نہیں۔ اپنے قارئین تک یہ اطلاع پہنچانی ہے کہ آسٹریلیا میں حیوان نوازی کا جو نمونہ گذشتہ دنوں دیکھنے میں آیا وہ ہم سب کے لئے قابلِ توجہ ہے، واقعات یوں بیان کئے جاتے ہیں کہ وہاں کوئی گھوڑا ہے جسے ایک کمپنی کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا ہے۔ یہ خدمت "اعزازی" ہے یعنی اس گھوڑے کو کوئی تنخواہ نہیں ملے گی اس کے علاوہ اس کا ووٹ بھی شمار نہیں کیا جائے گا لیکن وہ کمپنی کے ڈائرکٹروں کی میٹنگس میں شریک ہوا کرے گا!

کمپنی کا ڈائرکٹر بننے کو تو انسان بھی اپنے لئے اعزاز سمجھتا ہے لہٰذا لازم ہے کہ یہ گھوڑا بھی اپنی اس قدر افزائی پر ممنونیت کا اظہار کرے، اس سلسلے میں ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی یعنی جب یہ گھوڑا کمپنی کی کسی میٹنگ میں بطورِ ڈائرکٹر شریک ہوگا اس کی نشست کے لئے کس قسم کے انتظامات کئے جائیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹھیک اس وقت جب کوئی نازک مسئلہ زیرِ بحث آئے، یہ گھوڑے صاحب ناراض ہو جائیں اور قریب بیٹھے ہوئے ہم رتبہ ڈائرکٹر پر ایک دولتی جھاڑ کر نکل کھڑے ہوں ۔۔

اس دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ڈائرکٹروں کی میٹنگ جاری ہے نئے انتظامات کا مسئلہ زیر غور ہے۔

سود و زیاں کے فرق پر تبادلہ خیالات ہو رہا ہے کہ یکایک ایک ڈائرکٹر صاحب نے ہنہنانا شروع کر دیا اور دم کو اس طرح گردش دی کہ لوگوں کے ہاتھوں سے سگریٹ چھوٹ گئے!

ہمیں اس بات پر قطعی اعتراض نہیں کہ آسٹریلیا والوں نے ایک گھوڑے کو کمپنی کا ڈائرکٹر کیوں بنایا، ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ان ڈائرکٹر صاحب مدظلہ پر نگرانی رہنی چاہیئے اور کوئی ایسا شخص ان کے ساتھ ضرور رہنا چاہیئے کہ جو ان کی لگام ہاتھ میں رکھے اس لئے کہ گھوڑا ڈائرکٹر بننے کے بعد بھی گھوڑا ہی رہے گا۔ خبر نہیں کہ کب دلکی چلنے لگے اور کب سرپٹ دوڑنا شروع کر دے؟

ہمیں اس فیصلہ پر سخت اعتراض ہے کہ اس گھوڑے کا ووٹ شمار نہیں کیا جائے گا اس طرح تو کمپنی کو عمر بھر معلوم نہیں ہو سکتا کہ صنعتی اور تجارتی معاملات میں گھوڑے اور آدمی کے انداز فکر میں کیا فرق ہوتا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو (دہلی) سے ایسے گیت نشر کیئے گئے، جو ملک کے مختلف حصوں میں اناج پیستے ہوئے، کشتی چلاتے ہوئے یا کوئی دوسری محنت کرتے ہوئے گائے جاتے ہیں! یہ جدت قابل داد ہے۔ ہمارے ریڈیو کو کبھی ایسے گیت بھی نشر کرنے چاہیں جو ملک کے مختلف حصوں میں "بھیک" مانگتے ہوئے گائے جاتے ہیں! مثلاً

کچھ راہِ خدا دے جا، جا تیرا بھلا ہوگا

مائی بابا کی خیر ایک پیسہ دلوا!

وغیرہ وغیرہ

۶ر جولائی ۱۹۵۸ء

○

نوٹس دنیا ہماری دنیا کا ایک بہت مہذب اور آئینی طریقہ کار سمجھا جاتا ہے۔

مالک مکان کرایہ دار کو نوٹس دیتا ہے کہ جناب میرا مکان خالی کر دیجیے ۔ ورنہ ....

قرض خواہ مقروض کو نوٹس دیتا ہے کہ میری رقم فلاں تاریخ تک ملنی چاہیے ورنہ ..... بیوی اپنے شوہر کو نوٹس دیتی ہے کہ آپ سے شادی ہوئے پانچ برس ہو گئے ۔ آپ کا ایک بچہ بھی میری گود میں ہے لیکن آپ نے میرے نان نفقہ کا کوئی انتظام نہیں کیا تو میرے گذارے کی کوئی صورت پیدا کیجیے ورنہ ....

اس طرح آپ نے اپنی زندگی میں بے شمار نوٹس دیکھے ہوں گے اور لاتعداد "ورنہ" پڑھے ہوں گے لیکن کوئمبتور میں چائے کے جو باغات ہیں ان کے مزدوروں نے منتظمین کو حال ہی میں جو نوٹس دیا ہے وہ ہماری تہذیبی اور سماجی زندگی میں تاریخی حیثیت رکھتا ہے یعنی ان جدت پسند مزدوروں نے صاف صاف کہدیا ہے کہ پندرہ دن کے اندر اگر ان کی تنخواہ میں اضافہ نہ کیا جائے ورنہ پانچ ہزار مزدور اپنی داڑھیاں بڑھائیں گے اور کھانا نہیں کھائیں گے !

خیر یہ کھانا نہ کھانے کی دھمکی تو بہت پرانی ہو چکی ہے اور سیاسی معاملات سے لیکر خانگی امور تک اس کا کوئی نمایاں اثر باقی نہیں رہا ہے لیکن داڑھی بڑھانے کی بات البتہ جدید اور اس قدر خطرناک ہے کہ اس پر منتظمین کو متوجہ ہونا پڑے گا ورنہ ایک دن انہیں یہ روز بد دیکھنا پڑے گا کہ ایک دو نہیں بلکہ سارے پانچ ہزار انسان ناف تک اپنی داڑھیاں لٹکائے ہوئے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور سامنے نہیں کھڑے ہوئے ہیں تو خواب میں چلے آرہے ہیں ۔

پھر بھی ہمیں شبہ ہے کہ شاید چائے کے باغات میں داڑھی بڑھانے کا نوٹس ماحول کے لحاظ سے کچھ زیادہ موثر ثابت نہ ہو اس لئے کہ منتظمین یہ سوچیں بجا طور پر حق بجانب ہوں گے کہ جہاں لاکھوں چائے کے پودے پروان چڑھ رہے ہیں وہاں اگر پانچ ہزار داڑھیاں بھی نشو و نما حاصل کرلیتی ہیں تو یہ ان کی کامیابی ہے ۔

۱۹ جولائی ۱۹۶۱ء

ہمارے ملک میں مختلف قسم کے فنونِ لطیفہ کا رواج ہے۔ اور ایسے ایسے ماہرین پائے جاتے ہیں کہ دنیا والے دیکھیں گے تو دنگ ہو کر رہ جائیں گے۔ ان فنون میں ایک نمایاں فن "فریب دہی" کا ہے جس کے مختلف شعبے ہو گئے ہیں اور ہر شعبہ نہایت عمدگی سے ترقی کر رہا ہے!

چند روز پہلے دہلی میں ایک ایسے گروہ کا پتہ چلا تھا جو شادیاں کرانے کے بہانے سے ضرورت مند حضرات کو ٹھگ لیتا تھا اور بعد میں انھیں پتہ چلتا تھا کہ شادی تو بالکل نہیں ہوئی لیکن خانہ بربادی اچھی طرح ہو چکی ہے اس گروہ کے ایک رکن نے کمال کر دکھایا کہ ایک ہی لڑکی کیلئے چار "دولھا" تلاش کئے اور اتنی عمدگی اور رازداری کے ساتھ چاروں سے بات چیت کی کہ
ایک کو ایک کی خبر نہ ہوئی

چنانچہ شادی کے وقت دولہن والوں نے دیکھا کہ مختلف راستوں سے چار براتیں چلی آ رہی ہیں جن کی قیادت چار دولھے کر رہے ہیں اور حسب معمول ہر برات بینڈ باجے وغیرہ سے آراستہ ہے آپ ہی غور کیجئے کہ کتنا نازک لمحہ تھا دولہن بہر حال انسان ہوتی ہے کوئی تربوز تو ہوتی نہیں جس کے چار ٹکڑے کر کے چاروں دولھاؤں کو دیئے جائیں لہذا مشکل یہ آ پڑی کہ کس بارات کو ٹھیرایا جائے اور کس کو رخصت کر دیا جائے نتیجہ یہ نکلا کہ چاروں باراتیں حصول مقصد پر اڑ گئیں اور پھر باقاعدہ دولہن کا ہراج ہوا جسے شمالی ہند میں نیلام کہتے ہیں جس میں کسی چیز کے خواہش مند مختلف بولیاں بولتے ہیں اور ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں اور پھر ہراجی کی آواز سنائی دیتی ہے۔

ایک، دو، تین،

دولہن کا ہراج ملک کی تہذیب میں پہلا واقعہ ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ شریفانہ زندگی حاصل کرنے میں اور ایک کرسی خریدنے میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے!

کچھ لوگ فریب دہی کے ایک دوسرے شعبہ میں ماہر ہوتے ہیں ان کا طریقہ کار یہ ہے کہ اہل غرض کو قرض دلانے کی اُمید میں اسیر کیا اور خود انہی سے اتنی رقم لے اُڑے کہ ان کی ضرورت قرض میں اور اضافہ ہو گیا اس نوعیت کا ایک واقعہ بمبئی میں "گرفتار ہوا" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ گرفتار تو بعض لوگ ہوتے ہیں لیکن شہرت واقعہ کو مل رہی ہے واقعہ صرف اتنا ہے کہ "ماہرین" فن ضرورت مند بیوپاریوں کو کم شرح سود پر قرض دلانے کا یقین دلاتے تھے اور اپنا کمیشن پہلے ہی وصول کر لیا کرتے تھے بعد میں معلوم ہوتا تھا کہ سے

جو بیچتے تھے دوائے دل نہ دکان اپنی بڑھا گئے

ایک ایسے زمانے میں جب کہ دوسرے ممالک خلا میں اُڑنے کی کوشش کر رہے ہیں ہمارے یہاں زمین پر اس قسم کی فریب دہی کا فی سامان غور و فکر رکھتی ہے ۔

۲۲ جولائی ۱۹۶۱ء

O

جیسے جیسے دنیا آگے بڑھ رہی ہے موسیقی کے فوائد بھی نمایاں ہوتے جا رہے ہیں یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ موسیقی سے فصلوں کی نشو و نما میں بڑی مدد ملتی ہے خاص کر دھان کے پودے تو اتنے خوش مذاق واقع ہوئے ہیں کہ راگ راگنی ہلکے پھلکے گانے سن کر بڑی تیزی سے بڑھتے ہیں اور انسان کے لیے چاول کا ذخیرہ بناتے ہیں!

اب انگلستان کے ایک کسان نے اپنا یہ تجربہ بیان کیا کہ موسیقی سننے کے بعد اس کی بھینسیں معمول سے زیادہ دودھ دیتی ہیں اس لئے اپنے مویشی خانہ میں ریڈیو سٹ لگا رکھا ہے ۔

یہ خبر پڑھ کر ہمارا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ جب جوہری قوت سے متاثرہ مچھلیاں کھا کر یا پانی پی کے بیمار ہو سکتے ہیں تو کیا عجب ہے کہ موسیقی کے سہارے سے پیدا شدہ چاول اور دودھ بھی استعمال کرنے والوں کے مزاج کو متاثر کریں۔ مثلاً یہ کہ ایک پلیٹ خشکہ کھاتے ہی یہ محسوس ہو کہ حلق سے باگیسری کے سُر نکل رہے ہیں یا آدھ سیر دودھ

پینے کے بعد پتہ چلے کہ "شیر خوار" ایک کونے میں بیٹھا ہوا بھیرویں الاپ رہا ہے ۔

تحقیق و تفتیش کے بعد معلوم ہونا چاہیئے کہ موسیقی کے اثرات سے اور کیا کام لئے جا سکتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی ایسی موسیقی ایجاد ہو گئی جو سامعین کی بھوک اڑا سکے تو موجودہ حالات میں ملک کے لئے بہت بڑا کارنامہ ہے ۔

اعداد و شمار جمع کرنے والوں نے ہمیں بتایا ہے کہ ہمارے آندھرا پردیش میں شہری آبادی میں کوئی قابل لحاظ اضافہ نہیں ہو رہا ہے اور انہی ماہرین کا یہ بھی بیان ہے کہ جب گذشتہ اپریل میں ہمارے یہاں جانور شماری کی گئی تو پتہ چلا کہ گھریلو جانوروں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے گویا یہی صورت حال ہے جس کی جانب جگر مرحوم نے اشارہ کیا تھا ؂

گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

یہ اعداد و شمار بلا شبہ تشویشناک ہیں آپ ہی غور کیجئے کہ ہمارا صوبہ جو بڑا مردم خیز ہے بہت مہذب اور اپنی شاندار روایات رکھتا ہے اگر اس طرح انسانوں سے محروم ہوتا رہے اور اس میں گھریلو جانوروں کی تعداد بڑھتی رہی تو تھوڑے دن بعد یہ منظر دیکھنے میں آئیگا کہ انسان تو دروازے پر بیٹھا ہوا چوکی داری کر رہا ہے ۔ اندر گھریلو جانور اجتماعی ضیافت سے لطف اٹھا رہے ہیں، اب تک ہم کہتے آئے ہیں کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس' لیکن آئندہ اگر یہ "محاورہ" ہماری زبان سے نکلا تو کیا عجب ہے کہ بھینس اپنی توہین سمجھ کر ہم پر حملہ آور ہو جائے اس لئے کہ اعداد و شمار کی روشنی میں ان کی اکثریت ہے اور ہم انسان اقلیت کا درجہ رکھتے ہیں !

مسلسل تجربات کے بعد ہم نے یہ مقولہ تراشا ہے کہ کتا بہت وفادار جانور ہے' ہو سکتا ہے کہ آئندہ اس کثرت کی بنا پر کتے اس مقولے سے ناراض ہونے لگیں اور ان کی جماعت میں یہ قول رائج ہو جائے کہ انسان بڑی بے وفا مخلوق ہے ۔

جانوروں کی آبادی کا بڑھنا انسانوں کی تعداد میں کمی ہونا کوئی خوشی کی بات نہیں
بلکہ ایک طرح قہر الٰہی ہے جس کے اسباب کا پتہ چلانا چاہیئے اور ہو سکے تو ہر انسان کو برے
اعمالوں سے توبہ کرنا چاہیئے !

یکم اگست سنہ ۱۹۶۱ء

○

حسن کے مقابلے اب ساری دنیا میں عام ہو چکے ہیں، یعنی پہلے تو شہروں میں امیدواران
حسن باہمی مقابلہ کے بعد کامیابی حاصل کر کے شہرت کی چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں اور چونکہ حسن
کے مقابلے میں عورتیں ہی شریک ہوتی ہیں (خدا جانے مرد کیوں شریک نہیں ہوتے) اس لیئے
انھیں مثال کے طور پر مس دہلی یا مس غازی آباد کا خطاب ملتا ہے پھر ان مقابلوں کو صوبائی
حیثیت دی جاتی ہے اور ان میں جو حسینہ منتخب ہوتی ہے اسے مس پنجاب یا مس بنگال
کا خطاب ملتا ہے پھر بات اس سے بھی آگے بڑھتی ہے اور ملکی سطح پر مقابلے کا انعقاد ہوتا ہے
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی خوش نصیب لڑکی مس انڈیا، یا مس فلپائن یا مس مصر کہلاتی ہے، اس کے
بعد جو مقابلہ ہوتا ہے اس میں تمام ممالک جسم کی بازی لگا دیتے ہیں، حالانکہ صحیح محاورہ
جان کی بازی لگا دینا ہے) یہاں تک کہ کوئی نہ کوئی حسینۂ عالم منتخب ہو جاتی ہے، اور باقی
عورتیں اس کی قسمت پر رشک کرتی ہوئی پھر اپنے کام دھندے میں لگ جاتی ہیں !

مردوں نے جو یہ حالت دیکھی تو وہ بھی صحت و قوت کو معیار ٹھیرا کر مقابلے کرنے لگے
اور مسٹر سنہ ۵۹ء یا مسٹر سنہ ۶۰ء کا خطاب پانے لگے خیر یہاں تک بھی غنیمت تھا کہ جس
طرح عورت کے لیئے حسن ایک نعمت ہے اسی طرح مرد کے لئے صحت و قوت بھی ضروری ہے
اس کے یہ معنی نہیں کہ عورتیں ہمیشہ بیمار اور کمزور رہنی چاہئیں، لیکن چند روز پہلے اٹلی میں
ایک مقابلہ ہوا جو قطعی لاجواب تھا، اس مقابلے میں دنیا کے سب سے زیادہ بدصورت مرد
کا انتخاب کیا گیا اور اسے بدصورت سنہ ۱۹۶۱ء کا خطاب ملا ہم نہیں چاہتے کہ مقابلے کے

اس سلسلے کو ختم کر دیا جائے، اس لئے کہ جب خوبصورتی کا مقابلہ ہوتا ہے تو بدصورتی کا بھی ہونا چاہیئے، لیکن ہماری رائے میں یہ مقابلہ صرف ظاہری خوبی یا خرابی پر منحصر نہیں رہنا چاہیئے بلکہ ان کے دائرہ عمل میں باطنی عیوب و محاسن کو بھی شامل کر لینا چاہیئے مثلاً مقابلے کے ذریعہ یہ معلوم کرنے کی کوشش ہونی چاہیئے کہ دنیا کا احمق ترین انسان کون ہے، چالاک ترین شخص کہاں رہتا ہے، سب سے زیادہ مکار آدمی کس ملک کا باشندہ ہے اور سب سے بڑھ کر خوشامد کرنے والا کس جگہ آباد ہے، امید ہے ان مقابلوں کے بعد انسان کا ظاہر و باطن ایک ہو جائے گا۔

۳ راگست ۱۹۶۱ء

○

کہتے ہیں صبح کا بھولا اگر چھ بجے شام تک بھی گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ چنانچہ جب ہم نے سنا کہ ہمارے وزیر منصوبہ بندی ملک کے تیسرے منصوبے میں انسداد رشوت ستانی کی مسلسل کوششوں کو بھی شامل رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں بڑی خوشی ہوئی گو آج ہمارے وطن کو آزاد ہوئے چودہ برس گذر چکے ہیں مگر ایک عظیم قوم کی زندگی میں چودہ برس چودہ گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہوتے ہماری حکومت مستحق مبارکباد ہے کہ اس نے چودہ برس بعد ہی سہی مگر رشوت ستانی کے انسداد کی جانب توجہ فرمائی اور اس حقیقت کو تسلیم کر کے کہ رشوت کسی ملک کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے۔ منصوبہ بندی کے تحت اس کے ازالہ کو ضروری سمجھا!

رشوت ستانی کی تاریخ بہت پرانی ہے، جب انسان غاروں میں رہتا تھا اس وقت بھی رشوت کھاتا تھا اور کھلاتا تھا، پھر جب اس میں کسی قدر تہذیب آئی تو رشوت بھی مہذب ہو گئی۔ یہ سلسلہ بڑھتا رہا یہاں تک کہ آج انسداد رشوت ستانی سے راستہ میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں اور تحقیقات کرنے والے عہدیدار یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ جس چیز کو رشوت سمجھا جا رہا ہے وہ تو ایک "تحفہ" ہے، جو کسی

غرض مند شخص نے کسی با اختیار شخصیت کی خدمت میں پیش کیا ہے اور اس پر کسی قسم کی گرفت کرنا انصاف کے خلاف ہے یعنی بالفاظ شعر ہے ؎

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

گہری نظر سے دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ رشوت ستانی کوئی جسمانی زخم نہیں ہے، جسے مرہم پٹی سے ٹھیک کر دیا جائے، بلکہ یہ تو ایک قسم کی روحانی بیماری ہے جو صرف تزکیہ نفس ہی سے دور ہو سکتی ہے، اگر حکومت نے واقعی تیسرے منصوبہ میں رشوت کے انسداد کا شعبہ بھی رکھا ہے تو اسے چاہئے کہ پہلے مرض کی صحیح تشخیص کرے اور پھر علاج کی جانب توجہ دے یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ لڑکی تو مبتلا ہے ہسٹریا میں اور عامل صاحب بیٹھے ہوئے بھانامتی کا علاج کر رہے ہیں!!!

کہتے ہیں کہ ایک بڑا جغادری قسم کا رشوت لینے والا عہدیدار تھا جب حکومت اس کی حرکتوں اور رشوت ستانیوں سے تنگ آ گئی تو اسے یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ بیٹھا ہوا سمندر کی لہریں گنتا رہے، ظاہر ہے کہ اس مصروفیت میں رشوت کا کوئی امکان نہ تھا لیکن اس شخص کی ذہانت دیکھئے کہ جب وہ سامنے سے کوئی جہاز آتا ہوا دیکھتا تو اسے محض یہ کہہ کر روک دیتا کہ جہاز سے "موج شماری" میں خلل پڑ رہا ہے جب جہاز کا عملہ اسے کچھ رشوت دیتا تب کہیں جہاز کو آگے بڑھنے کی اجازت ملتی۔

اگر حکومت نے خلوص اور دلچسپی کے ساتھ رشوت ستانی کے انسداد پر توجہ دی تو اسے ہر جگہ بے شمار لوگ ملیں گے جو صرف موجیں گنتے ہیں جہازوں کو روکتے ہیں اور دھڑلے سے رشوت کھاتے ہیں۔

۲۷ اگست ۱۹۶۱ء

⊙

جیسے جیسے ہمارا ملک ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے، اشیاء کی ناجائز درآمد

برآمد کا کاروبار بھی بڑھ رہا ہے، اگر باقاعدہ پیمائش کی جائے تو پتہ چلے گا کہ ہی ہندستان میں جو نہایت پسماندہ، مشہور ہے ایسے ایسے اسمگلر پڑے ہوئے ہیں، جو ایک ہاتھ سے یہ ناجائز کاروبار کرتے ہیں اور دوسرے ہاتھ کو اس کی خبر ہونے نہیں دیتے، انہوں نے قانون اور محصول کی زد سے بچنے کیلئے وہ طریقے ایجاد کئے ہیں کہ اگر یونانی "حکیم افلاطون بھی زندہ ہوتا تو ہندستانی ذہانت پر عش عش کرنے لگتا اور کیا عجب کہ غش کر جاتا! بہت دن ہوئے خبر آئی تھی کہ ایک گروہ نے جب افیون کی بہت بڑی مقدار ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنی چاہی تو افیون سے ایک تودے کو مُردے کی شکل میں ڈھال دیا۔ اسے کفن پہنایا، اس پر پھول ڈالے، عرق گلاب وغیرہ چھڑکا اور ریل کا ایک ڈبہ ریزرو کرائے مذکورہ مردے کو منزل مقصود کی جانب اس طرح روانہ کیا گویا سے

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

مگر آپ جانتے ہیں پولیس کے کان بھی تیز ہوتے ہیں آنکھیں بھی بڑی دور رس ہوتی ہیں اور ناک کی تو قوت شامہ کا تو کوئی جواب ہی نہیں، یعنی اس محکمہ میں انسان تو انسان بعض کتے اتنی حساس ناک کے مالک ہوتے ہیں کہ مجرم کی بو پر پہونچتے ہیں چاہے وہ پاتال ہی میں چھپا ہوا کیوں نہ ہو، تو خیر افیون کا وہ جنازہ بھی ایک اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا اور جو لوگ اس کے ساتھ تھے، پہلے مصنوعی طریقے پر رو رہے تھے، وہ بعد میں واقعی اشکبار ہوگئے اسمگلنگ کرنے والے بڑے ذہین اور فریس ہوتے ہیں، مثلاً ایک صاحب لکڑی کی مصنوعی ٹانگ لگائے پھرتے تھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ ٹانگ اندر سے خالی ہے اور سونے کی سلاخیں چھپانے کا کام دیتی ہے، ایک دوسرے صاحب نے تو حد کر دی وہ جواہرات کی ناجائز تجارت کا مذاق رکھتے تھے، ان کا طریقہ یہ تھا کہ مناسب مقدار میں جواہرات کو منہ کے ذریعہ پیٹ میں پہونچا دیتے اور پھر مقررہ جگہ پر پہونچ کر جلاب کے ذریعہ سارا مواد فاسد خارج کر دیتے تھے، آپ کو یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوگی کہ موصوف بھی ایکسرے

کے ذریعہ پکڑے گئے۔

اب کلکتہ سے اطلاع آئی ہے کہ وہاں ایک صاحب حوالات کی ہوا کھا رہے ہیں، جن کے جوتے سے چالیس ہزار روپیہ کی مالیت کا سونا برآمد ہوا تھا، ممکن ہے اپنی گرفتاری کے وقت موصوف نے فرمایا ہوگا کہ میں دولتِ دنیا کو اپنے جوتے کے برابر سمجھتا ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ پولیس کا مہمان ہونے سے پہلے آپ نے یہ مشہور شعر بھی پڑھا ہو ؎

زر کی جو محبت تجھے پڑ جائیگی بابا
ایک روز یہی، جوتیاں کھلوائیگی بابا

اٹلی میں موٹروں کی ایک شاندار ریس ہوتی ہے، اس مرتبہ ریس کے دوران میں حادثہ ہوگیا، یعنی ایک موٹر اپنا صحیح راستہ چھوڑ کر تماشائیوں کے مجمع میں گھس گئی، نتیجہ کے طور پہ بارہ اشخاص ہلاک ہوگئے، اور بہت سے زخمی ہوئے!

یہ خبر پڑھ کر ہم سوچتے رہے کہ آخر اٹلی کی مذکورہ موٹر، اور ہمارے گھوڑے میں کیا فرق ہے، ایک زمانہ تھا جب شہسواری کے کمالات دکھائے جاتے تھے، اور اس وقت کوئی شریر گھوڑا، بدک کر مجمع میں گھس جاتا تھا، اگر کوئی موٹر بھی اس قسم کی حرکتیں کرنے لگے تو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ اس میں HORSE POWER بہت زیادہ تھا

۱۳ ستمبر ۱۹۶۱ء

○

کسی استاد کا یا شاید کسی شاگرد کا شعر ہے۔

نمودِ وجودِ بشر کیا محیطِ عالم میں
ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا

مطلب یہ کہ ہستی انسانی نہایت ہی ناپائدار واقع ہوئی ہے، اور جس طرح پانی کا بلبلا ہوا کے ایک جھونکے سے غائب ہوجاتا ہے، اسی طرح انسان بھی موت آتے ہی اس جہانِ فانی سے تشریف لے جاتا ہے!

شعر بہت ہی عمدہ ہے اور اس سے کافی عبرت و بصیرت حاصل کی جاسکتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس میں صرف انسان ہی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، انسان کے علاوہ اس دنیا میں اور خاص کر ہمارے ہندستان میں آئے دن جو چیزیں غائب ہوتی رہتی ہیں ان کے حالِ زار پر کوئی روشنی نہیں پڑتی، مثال کے طور پر آپ نے دیکھا ہوگا کہ سڑک پر پانی کے لئے ایک نل لگا ہوا ہے جس کی ٹوٹی بھی موجود ہے، دوسرے دن جو آپ وہاں تشریف لے گئے تو کیا دیکھا کہ نل موجود ہے، پانی بہہ رہا ہے مگر ٹوٹی غائب ہے، ریلوں میں روشنی کے لئے بجلی کے جو بلب لگے رہتے ہیں انھیں سرقہ کرلیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اسٹیشن پر مسافروں کے لئے جو نشستیں بنی ہوئی ہوتی ہیں ان کے تختے تک غائب کردیئے جاتے ہیں اور ہمارے یہاں کے صابر و شاکر مسافر پلیٹ فارم کی زمین پر ہی بیٹھ جاتے ہیں!

جو اِس دنیا میں آیا ہے اُسے ایک دن یہاں سے جانا ضروری ہے لیکن یہ اندھیر نہیں دیکھی جاسکتی کہ آج ہی آپ نے اپنے دروازہ پر "صندوقِ خطوط اندازی" لٹکایا اور کل ہی وہ غائب ہوگیا! حد ہوگئی کہ ایک صاحب نے بڑے شوق سے اپنے نام کی پلیٹ بنوا کر مکان پر لگوائی۔ مگر دوسرے دن جو دیکھا تو پلیٹ غائب تھی اور وہ خود یہ سوچ رہے تھے کہ اس مکان میں کون رہتا ہے۔

شارعِ عام پر بازاروں میں اور گلیوں میں چیزوں کا غائب ہوتے رہنا دستِ غیب کا کرشمہ ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ کوئی باقاعدہ اور پیشہ ور چور تو ایسی حرکت کر نہیں سکتا۔ جس کا حاصل سوائے تضیعِ اوقات کے اور کچھ نہ ہو بہرحال جب شاعر نے انسان کی بے ثباتی کا ذکر کیا تھا تو اسے چاہئے تھا کہ دوسری اشیاء یا محتاج کی بے اعتباری کو بھی واضح کرتا تاکہ بات

پوری ہو سکتی !

مگر افسوس ہے کہ وہ پرانے زمانے کا شاعر تھا۔

۱۶ ستمبر ۱۹۶۱ء

○

تقریباً ہر زبان میں کچھ کہاوتیں ایسی رائج ہو جاتی ہیں جن کے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ

نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

یعنی کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کہاوت کب شروع ہوئی تھی اور کب ختم ہو گئی یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی شان نزول کیا ہے، اسے کس موقع پر وضع کیا گیا تھا، اور اس کی تخلیق کے پیچھے کون سے محرکات کام کر رہے تھے۔ مثلاً ہم میں سے ہر شخص انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے دوسروں کو ساکت و خاموش کرنے کے لئے کہتا ہے کہ ـــــ وہ زمانہ گیا جب خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے ایک صاحب نے جو تحقیق و تفتیش میں اپنے وقت کا بہت بڑا حصہ صرف کرتے رہتے ہیں، بے شمار تاریخی کتابیں چھان ماریں، مگر یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ خلیل خاں صاحب کون بزرگ تھے، کس زمانے میں پائے جاتے تھے اور یہ کہ آپ پر کونسی بپتا پڑی تھی، جس کی وجہ سے آپ نے اچھے خاصے کبوتروں کو چھوڑ کر فاختہ اڑانے کا شغل اختیار کر لیا!

ان محقق صاحب کا بیان ہے کہ انہوں نے پہلے تو اس زمانہ کی تاریخ دیکھی، جب ہندوستان پر پٹھانوں کی حکومت تھی اور شیر شاہ کا سکہ چل رہا تھا لیکن انہیں خلیل خاں کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

اس کے بعد انہوں نے تاریخ افغانستان کا مطالعہ فرمایا لیکن سوائے ناکامی کے کوئی بھی ایسا شخص دستیاب نہیں ہوا، جس کا نام خلیل خاں ہو اور جو واقعی اپنے گھر میں بیٹھا ہوا فاختہ اڑاتا رہتا ہو!

اس طرح ہم لوگ بعض خاص مواقع پر اپنی زبان دانی کا اظہار یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ ...

"آم کے آم گٹھلیوں کے دام" — یار لوگوں نے بہت زور مارا مگر قطعی پتہ نہیں چلا کہ آم کی گٹھلیاں کس زمانے میں دام کے مستحق سمجھی جاتی تھیں؟ غرض کہ بے شمار مقولے ہیں جو ہماری زندگی پر اثر انداز ہیں لیکن ہم ان کے "مالہٗ وما علیہ" سے بالکل بے خبر ہیں پھر بھی انسان روایت پسند ہوتا ہے۔ اور خاص کر ہندوستان کا انسان تو پرانے اقوال زریں پر اپنے اعمال کی بنیاد رکھنا "فال نیک" سمجھتا ہے، لہٰذا ہمیں کیرالا کی ایک خبر سن کر کوئی حیرت نہیں ہوئی واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہاں حکومت کے دو گھوڑے قطعی ناکارہ ہو چکے تھے، اس لئے حکومت نے انھیں ہراج کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ خیال تھا کہ اس طرح خاصی رقم حاصل ہو جائے گی۔ اس نفع خوری کے لالچ میں کئی ہزار روپے ان گھوڑوں کی تشہیر پر صرف کر دیئے گئے، لیکن جب ہراج کا نتیجہ برآمد ہوا تو پتہ چلا کہ دونوں گھوڑے صرف تیس روپے میں فروخت ہوئے کہ جن کے نصف مبلغ پندرہ ہوتے ہیں!

ظاہر ہے کہ جو ارباب اقتدار "گٹھلیوں کے دام" حاصل کرنا چاہتے تھے انھیں سخت ناکامی ہوئی، گھوڑوں کی پبلسٹی پر ہزاروں روپیہ صرف کرنے کے بعد تیس روپیہ حاصل کرنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اب ہمیں "آم کے آم گٹھلیوں کے دام" والی کہاوت بدل دینی چاہیے۔ لیکن آپ یقین رکھیے کہ کہاوت نہیں بدلے گی اور جب تک ہماری زبان پھولتی پھلتی رہے گی، نئی نئی کہاوتیں عالم وجود میں آئیں گی ۔۔۔

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

۱۹ ستمبر ۱۹۶۱ء

○

یقین کریں یا نہ کریں خبر یہ ہے کہ نظام آباد سے ایک خط ۲۳ مئی ۱۹۵۵ء کو روانہ ہوا اور ۲۲ ستمبر ۱۹۶۱ء کو حیدرآباد پہنچا، اس طرح مذکورہ خط نے

اپنا سفر تقریباً چھ سال میں پورا کیا! خبر میں جو تفصیلات دی گئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خط جس وقت لکھا گیا تھا اس وقت دوسرا پنجسالہ منصوبہ شروع ہو چکا تھا۔ گویا حضرت جگر مرادآبادی کے الفاظ میں ؎

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گذر گئے ؎ بیٹھے ہم انتظار سحر دیکھتے رہے

ہندستان میں خطوط رسانی کی تاریخ بہت قدیم اور نہایت حیرت ناک ہے ایک زمانہ تھا جب ہم خطوط کبوتروں کے ذریعہ ایک دوسرے تک پہونچایا کرتے تھے یہ کبوتر اعلیٰ درجہ کے تربیت یافتہ ہوتے تھے۔ لیکن بہرحال کبوتر تھے، اور ان سے کبھی کبھی لغزش بھی ہو جاتی تھی، مثال کے طور پر آپ نے ایک نامۂ شوق لکھکر کبوتر کے پروں میں باندھ دیا اور اسے اپنے محبوب کی جانب اڑا دیا لیکن شومیٔ بخت سے اس کبوتر کو راستے میں خود اس کی محبوبہ مل گئی، اب کہاں کا خط اور کیسی پیام رسانی کبوتر صاحب کسی درخت کی شاخ پر بیٹھے ہوئے اپنی محبوبہ سے محو اختلاط ہیں اور آپ کا افسانۂ عشق ان کے پروں سے بندھا ہوا ہے۔

اس زمانے میں محبوب لوگوں کی اکثریت محبت کرنے والوں سے دور رہنا چاہتی تھی، اور خطوکتابت کو پسند کرتی تھی۔ چنانچہ ایک شاعر نے جو شاید عاشق بھی تھا، اپنی اور کبوتر کی مشکل کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

خط کبوتر کس طرح لے جائے بام یار پر ؎ پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کبوتر صاحب آپ کا خط لیکر گھر سے نکلے اور غائب دماغی کی وجہ سے مکتوب الیہ تک پہونچنے کے بجائے اپنے گھونسلے کی طرف چلے گئے اور وہاں بہ اطمینان تمام عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے اب آپ ہیں کہ پریشانی کے عالم میں رات کو تارے گن رہے ہیں اور دن کو سورج سے آنکھیں ملا رہے ہیں۔ لیکن "قاصد گم گشتہ" کسی طرح واپس نہیں آتا!

ہوائی جہاز اور ریل وغیرہ کی ایجاد کے بعد خطوط رسانی بہت آسان ہو گئی تھی، لیکن
اب جو یہ نظام آباد کی یہ خبر نظر سے گذری تو ہم سوچ رہے ہیں کہ وہ پہلا زمانہ ہی اچھا تھا۔ اب تو
محکمہ ڈاک کی مہربانی سے اس بات کا امکان بھی پیدا ہو گیا ہے کہ اگر ایک باپ اپنے شادی شدہ
بیٹے کو خط لکھے تو وہ اس کے پوتے کو ملے اور اسی دوران میں اس کا بیٹا جو اصل مکتوب الیہ
تھا، شادی خانہ آبادی وغیرہ سے فارغ ہو کر اللہ تعالیٰ کے پاس پہونچ گیا ہے!

انجکشن کی ایک شیشی میں مری ہوئی مکھی پائی گئی!

اس خبر سے بہ یک وقت دو "عبرتیں" حاصل ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس مکھی کی موت آ گئی
تھی اس لئے وہ شہد کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے انجکشن کی طرف دوڑی، دوسرے یہ کہ انجکشن
کا چھوٹے سائز میں بنایا جانا مصلحت خداوندی ہے، ورنہ اگر انجکشن کی شیشیاں بڑی بننے لگیں
تو کیا تعجب ہے کہ ان میں مینڈک، خرگوش اور کبھی کبھی لومڑی جیسے جانور بھی پائے جائیں۔

۲۶ ستمبر ۱۹۶۱ء

O

جہاں تک نشیات و مسکرات کی تاریخ کا تعلق ہے بعض محققین کہتے ہیں کہ حقہ لکھنؤ
میں ایجاد ہوا، اور یہیں اس نے ارتقاء کی مختلف منزلیں طے کیں لیکن ہم ہندوستانیوں کے
تواہل و تساہل کی یہ عبرت انگیز مثال ملاحظہ فرمائیے کہ حقہ پینے کا مقابلہ (ٹورنامنٹ) دمشق
میں منعقد ہونے والا ہے!

انسان جب سے پیدا ہوا ہے کسی نہ کسی قسم کا مقابلہ کرتا چلا آیا ہے، کشتی کا مقابلہ
یعنی دوڑ کا مقابلہ، ہائی جمپ اور لانگ جمپ کا مقابلہ یہاں تک کہ اب ہمارے یہاں
مرن برت رکھنے کا مقابلہ بھی شروع ہو چکا ہے۔ مگر حقہ پینے کا مقابلہ اپنی نوعیت کے
لحاظ سے اس درجہ نادر ہے کہ اس کی مثال نہ تو ماضی کی تاریخ میں ملتی ہے اور نہ

انشاء اللہ مستقبل کے حالات میں نظر آئے گی۔

سنا ہے کہ حقہ پینے کے اس ٹورنمنٹ میں جو لوگ حصہ لیں گے وہ حقہ کی نے کو منہ سے لگائے بغیر مسلسل کش لگاتے رہیں گے۔ اور جو شخص زیادہ دیر تک منہ سے دھواں نکالتا رہے گا اسے چمپین سمجھا جائے گا اور وہ انعام و احترام کا مستحق قرار پائے گا۔

ہماری زندگی میں حقہ کا بہت اہم حصہ ہے اور چونکہ ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اس لئے اردو ادب میں بھی حقہ کے موضوع پر کافی داد سخنوری دی گئی ہے، مثال کے طور پر پہلوان سخن حضرت ناسخ نے بادشاہ وقت کو حقہ نوشی میں مشغول دیکھ کر ایک دفعہ یوں فرمایا تھا ؎

حقہ جو ہے حضورِ معلیٰ کے ہاتھ میں ؛ گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں
ناسخ یہ سب بجا ہے و لیکن تو عرض کر ؛ بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

حیف صد حیف کہ اب وہی بے جان حقہ کسی ہندستانی مسیحا کے ہاتھ میں بولنے کے بجائے دمشق میں بول رہا ہے، اور ہمارے ہندستان کا سر شرم سے جھکا جا رہا ہے!

لیکن ہندستان کے جھکے ہوئے سر کو بلند کرنے کے لئے ضروری نہیں کہ ہم بھی حقہ نوشی کا کوئی ٹورنمنٹ منعقد کر ڈالیں، اس لئے کہ یہ تو دمشق والوں کی تقلید ہوگی، ہمیں چاہیے کہ مقابلہ کا کوئی دوسرا موضوع تلاش کریں جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی

اس سلسلے میں زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں ہمارے یہاں افیون نوشی یا افیون خوری کا ذوق بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ ہم اس "فن لطیف" کا ایک مقابلہ رکھ سکتے ہیں، جس میں ملک کے ہر گوشے سے اہل ذوق شریک ہوں اور جو زیادہ سے زیادہ افیون استعمال کرنے کے بعد بھی خر سے لگا کرتا رہے اسے "ہیرو" سمجھ لیا جائے!

بہر حال ہمیں افسوس ہے کہ حقہ نوشی کے فن پر جو خالص ہندستانی تھا دمشق کے

باغیوں نے قبضہ کر لیا ہے ؎

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا ٭ ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

۲۷ ستمبر ۱۹۶۱ء

O

ہم غالب کا یہ شعر

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ ٭ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا

تقریباً فراموش کر چکے تھے۔ کل کے اخبار میں ایک خبر نظر سے گذری اور غالب مرحوم مع اپنے اس شعر کے ہمارے ذہن کی فضا میں دوبارہ تشریف لے آئے تفصیلات یہ ہیں کہ ملکاپور میں پولیس نے جوے کا ایک اڈّا دریافت کیا ہے۔ یا گرفتار کیا ہے۔ جس پر مرکز تعلیم بالغان کا بورڈ لگا ہوا تھا گویا سب کو دکھانے کے لیے اِس جگہ بالغوں کی تعلیم دی جاتی تھی اور دراصل میں قمار بازی ہوتی تھی' جن چار حضرات کو اس مرکز تعلیم بالغان سے پکڑا گیا ہے اُن کے قبضہ میں کتابوں وغیرہ کے بجائے تاش کے پتے تھے' ایکہ' بادشاہ' رانی' اور غلام!

جن لوگوں نے جوا کھیلنے کی جگہ کو مرکز تعلیم بالغان سے تعبیر کیا ہے ان کی معاملہ فہمی لائق داد ہے' اس لئے کہ رستم کے ساتھ جوا کھیلنے والے اکثر و بیشتر بالغ لوگ ہی ہوتے ہیں اور بچے علی العموم اس قمار خانۂ عشق سے دور ہی رہتے ہیں جیسا کہ کسی سر پھرے شاعر نے کہا بھی ہے ؎

"عاشقی کھیل نہیں ہے جسے لڑکے کھیلیں"

جوا کھیلنے والا انسان تعلیم بالغان حاصل کر کے ایک دن اس منزل پر پہونچ جاتا ہے جہاں وہ غالب ہی کی زبان میں بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے کہ ؎

"بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے"

لیکن اسے نہ تو اپنی سماجی ذمہ داری کا احساس رہتا ہے اور نہ وہ پولیس وغیرہ سے ڈرتا ہے، بس جوا کھیلتا ہے اور نتائج و عواقب کو اللہ تعالیٰ یا عدالت کے سپرد کر دیتا ہے!

اِس خبر کو پڑھنے کے بعد ہمیں غالب مرحوم بے ساختہ یاد آگئے اور اس کی وجہ سوائے اِس کے کچھ نہیں کہ بعض بیانات کے مطابق موصوف بھی جوئے کے الزام میں پکڑے گئے تھے اور کافی پریشان ہوئے تھے!

جب ایک ایسا مرکز ظاہر ہو چکا ہے، جہاں تعلیم بالغان کا بورڈ لگا کر جوا کھیلا جاتا تھا تو ظاہر ہے کہ پولیس کو چوکنا ہو جانا چاہیے" اور ایسے مزید مرکزوں کا پتہ چلانا چاہیے۔ جہاں بورڈ اور کاروبار میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے ۔

"ہم نے کچھ سمجھا وہ کچھ نکلے بڑا دھوکا ہوا"

۲۱ر اکتوبر ۱۹۶۱ء

○

یہ واقعہ بمبئی کا ہے اور کافی عبرت انگیز ہے کہ پولیس نے ایک راہرو کو روک کر جب اس کے ہینڈ بیگ کو کھولا تو اس کے اندر سے بیس ہزار روپے کی گھڑیاں برآمد ہوئیں جو ظاہر ہے کہ اسمگل کی گئیں تھیں۔

ہمارے ملک میں جس طرح دوسرے امراض خبیثہ ہیں اسی طرح اسمگلنگ کی بیماری بھی بہت عام ہے اِس کے جراثیم بڑے شہروں میں زیادہ پرورش پاتے ہیں اور اِسکی علامتیں یہ ہیں کہ مریض بظاہر بیروزگار ہوتے ہوئے بھی کافی خوشحال اور مطمئن نظر آتا ہے جیسے جیسے اس کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کا اطمینان ترقی کرتا ہے بیماری میں شدت پیدا ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ ایک دن اللہ کو پیارا ہونے کے بجائے پولیس کو پیارا ہو جاتا ہے بمبئی کلکتہ دہلی وغیرہ جیسے عظیم شہروں میں ایسے بہت سے لوگ آپ کو (پولیس کو نہیں)

چل سکتے ہیں جنھوں نے اپنی ابتدائے آفرینش سے کوئی جرم نہیں کیا لیکن اِن کی تمام ضرورتیں بحسن وخوبی پوری ہوتی رہتی ہیں اِس صورتِ حال کو دیکھ کر عام لوگ سمجھتے ہیں کہ موصوف دستِ غیب کے عمل میں ماہر ہیں اور پولیس تفتیش وتحقیق کے بعد اس نتیجہ تک پہونچی ہے کہ اِنجناب اسمگلنگ سے شوق فرما رہے ہیں۔

جب سے ہمارے یہاں بیرونی اشیاء کی درآمد پر پابندیاں عاید کی گئی ہیں اسمگلنگ کے ذوقِ لطیف نے خاص ترقی کی ہے باذوق حضرات انگلستان کی امریکہ کی، جاپان کی اور دوسرے صنعتی ممالک کی مصنوعات چوری چھپے سے منگواتے ہیں یا خود لے آتے ہیں اور پھر انھیں یہاں بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت کر کے شان وشکوہ کے ساتھ شاہانہ زندگی بسر کرتے ہیں؛
حالات یہی رہے تو وہ دن دور نہیں جب پولیس ہر راہرو کے ہینڈ بیگ کو دیکھنا ضروری سمجھے گی اور کوئی شخص بغیر جامہ تلاشی کے منزلِ مقصود تک نہیں پہونچ سکے گا!

ابھی ہم اِس واقعہ پر نوحہ وماتم میں مصروف ہی تھے کہ بمبئی کی ایک دوسری خبر نظر سے گذری کہ پولیس نے وہاں تین جاروب کشوں کو چوری کے الزام میں پکڑ رکھا ہے جنھوں نے ادویات کے تھیلے چرائے تھے!

جاروب کشوں کی چوری میں ہمیں ایک قسم کی رعایت لفظی (اور رعایت معنوی بھی) نظر آتی ہے مطلب یہ کہ جاروب کشوں کا کام صفائی کرنا ہے، خواہ وہ گرد وغبار کی صفائی ہو یا ادویات کے تھیلوں کی!

۷ر نومبر سنہ ۱۹۶۱ء

○

اب تو خیر (CLEEN SHAVE) کا فیشن ساری دنیا میں عام ہے،
یہاں تک کہ ہمارا ملک بھی جو اپنی قدامت پسندی کے لئے چار دانگ عالم میں شہرت رکھتا ہے

چہرے کے داڑھی مونچھ سے بے نیاز رہنے والوں کی اکثریت پر نازاں ہے لیکن ایک زمانہ تھا جب کم از کم مونچھیں رکھنا آئین مردانگی میں شامل تھا' اور بعض لوگ تو اس سلسلے میں اتنے آگے بڑھے گئے تھے کہ صرف مونچھ رکھنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ مونچھ پر لیمو رکھ کر اپنے پختہ مشق ہونے کا ثبوت بہم پہونچاتے تھے!

حقیقت یہ ہے کہ مونچھ رکھنے کے رواج سے علاوہ دوسرے فوائد کے ہماری زبان میں کئی محاوروں کا اضافہ ہوا' مثلاً مونچھوں پر تاؤ دینا (ظاہر ہے کہ داڑھی پر تاؤ نہیں دیا جا سکتا) مونچھیں منڈوا ڈالنا' مونچھ نیچی کر لینا اور سب سے بڑھکر یہ کہ ؎

موںچھ والا تیری قدرت کا تماشا دیکھے

خدا کا شکر ہے کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی جب کہ چہروں کی صفائی دل کی صفائی سے زیادہ ضروری سمجھی جانے لگی ہے ایسے ایسے لوگ موجود ہیں جن کی مونچھیں نہ صرف دیکھنے کے قابل ہیں بلکہ تاریخ میں جگہ پانے کی [illegible] ہیں مثال کے طور پر الہ آباد میں ایک صاحب [illegible] پتہ چلا ہے جو بیس انچ لمبی مونچھیں رکھتے ہیں اور اپنے وقت کا بڑا حصہ ان کی نگہداشت کرنے اور ان پر تاؤ دینے میں صرف کرتے ہیں!

اتنی لمبی مونچھیں بلاشبہ دیدہ زیب بھی ہو سکتی ہیں اور وقت ضرورت ان سے کام بھی لیا جا سکتا ہے' فرض کیجئے رات کے وقت گھر میں چور گھس آیا ہے جسے پکڑ بھی لیا گیا ہے۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ اس کے ہاتھ کس چیز سے باندھے جائیں' اس نازک لمحہ میں بیس انچ لمبی مونچھیں کار آمد ہوتی ہیں' یعنی چور کے دونوں ہاتھ مونچھوں سے باندھ دیئے اور صبح کے انتظار میں آرام سے سو رہے' اس کے بھاگ جانے کا کوئی امکان نہیں اور اگر بدقسمتی سے چور فرار ہونے کی کوشش بھی کرے گا تو وہ صورت حال پیدا ہو جائے گی جس کی جانب شاعر نے اشارہ کیا ہے ؎

ہم تو بھاگیں گے مگر تجھ کو بھی لے بھاگیں گے

حسن و محبت اور شعر و شاعری کی دنیا میں بھی مونچھیں بڑی معنی خیز ثابت ہو سکتی ہیں شلاً ؎

جذبۂ عشق سلامت ہے تو انشاء اللہ ؛ میری مونچھوں سے چلے آئیں گے سرکار بندھے

۱۶ر جنوری ۱۹۶۲ء

○

تماشا دیکھنے کا شوق انسانی فطرت کا جزو ہے اور انسان ہر بندہ رہیں "تماشا" دیکھنے کو دوسرے مشاغل پر ترجیح دیتا ہے، بعض مستند تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا غالب مغفور بھی تماشے کے بڑے رسیا واقع ہوئے تھے، خود ان کے کلام میں ایسے اشارے موجود ہیں، جن سے اس شبہ کی تصدیق ہوتی ہے، چنانچہ ایک جگہ فرمایا ہے ؎

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب ؛ تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

غالب کے زمانے میں تماشائے اہل کرم دیکھنے کے لیے کم سے کم فقیروں کا بھیس بنانا ضروری تھا۔ لیکن آج کل حضرت سے پھیلی ہوئی بیروزگاری نے اس قید کو بھی اٹھا لیا ہے لوگ اپنے اصلی لباس میں گھروں سے نکلتے ہیں، اور تماشائے اہل کرم دیکھتے پھرتے ہیں، ان کا کام محض یہ نہیں ہوتا کہ ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے ؛ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

بلکہ یہ جہاں بھی جاتے ہیں، کسی مرگ ناگہانی کا افسانہ سناتے ہیں ــــــ لاش بے گور و کفن پڑی ہوئی ہے، ــــــ کوئی پرسان حال نہیں ــــــ اُسے اول منزل تک پہونچانے میں مدد کیجئے ــــــ بڑا ثواب ہوگا ــــــ وغیرہ وغیرہ ؟

ظاہر ہے کہ ایسی صداؤں سے پتھر کا دل بھی پسیج جاتا ہے، ان حضرات کی جیب گرم ہو جاتی ہے، اور چونکہ "مردے" کا حقیقتاً کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کے دوزخ یا جنت میں جانے کی بحث بھی نہیں اٹھتی ۔ ان کی حاجت روائی کرنے والا سمجھتا ہے کہ اسے ثواب دارین مل گیا، اور یہ لوگ سوچتے ہیں کہ آج کے لئے گز بھر کے پیسے نکل آئے :

مگر چند روز پہلے جب ایک صاحب کا سابقہ نئی نسل سے پڑا تو نتائج نہایت غور طلب نکلے، نوجوانوں نے ان سے کہا کہ ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں اور لاش کی تجہیز و تکفین کا انتظام کئے دیتے ہیں، صاحب موصوف بہت سٹپٹائے اور جب انھیں محسوس ہوا کہ اس بار یہ تماشائے اہلِ کرم بہت مہنگا پڑ رہا ہے تو راہِ فرار اختیار کرنے میں مصلحت دیکھی اور پیسے لئے بغیر بھاگ کھڑے ہوئے سے

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس سلسلے میں ایسے ایسے خوش پوش گداگر بھی دیکھنے میں آئے ہیں، جن کے اعزا میں سے کوئی مثلاً بیوی، بھائی، یا والدِ محترم ایک مہینہ میں کئی کئی بار مرتے رہتے ہیں، یعنی اگر یہ منگل کے دن گھر میں یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ ان کی نانی مر گئی ہے، تو جمعہ کے دن کسی دوسرے گھر میں ان کا نوحہ یہی ہوتا ہے کہ وہ نانی پھر مر گئی ہے، حالانکہ اگر تحقیق کی جائے تو پتہ چلے کہ موصوف کی نانی غدر کے کچھ دن بعد ہی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔

ظاہر ہے کہ ایسے "تماشا بینوں" کو عام لوگ راہِ راست پر نہیں لا سکتے اور یہ معاملہ قابلِ دست اندازیٔ پولیس ہونا چاہیے، یعنی جب بھی کوئی شخص اپنے کسی عزیز کو فرضی طور پر خدا کے گھر بھیج کر طالبِ امداد ہو، اسے سپردِ پولیس کر دیا جائے کہ یا تو اس آنجہانی کی لاش دکھاؤ ورنہ حوالات میں آرام کرو!

۲۴ مارچ ۱۹۶۲ء

○

ضرورت ایجاد کی بیٹی جسے عرفِ عام میں ایجاد کہتے ہیں آج کل آپے سے باہر ہوتی جا رہی ہے یعنی موجدین ایسی ایسی چیزیں ایجاد کرنے لگے ہیں جنھیں دیکھ کر عقل دنگ ہے اور حواس جواب دیئے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر لندن میں کسی صاحب نے ایک ایسا آلہ ایجاد کر کے رکھ دیا ہے جس کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ حاملہ عورت کے بطن میں لڑکا ہے یا لڑکی اس آلہ کی قیمت

(۷) سو پونڈ ہے۔

اول تو ہم یہ بات بالکل نہیں سمجھ سکے کہ پیدائش سے پہلے اولاد کی "جنس" معلوم کرنا کیوں ضروری ہے ؟ اس سلسلے میں ہمیں اِن مشہور بزرگ کا لطیفہ یاد آرہا ہے جو بال کٹوانے کے لئے کسی ہیر کٹنگ سیلون پر پہونچے اور حجام سے پوچھنے لگے کہ میرے سر میں کتنے بال ہیں یہ حجام بڑا سنجیدہ اور دور اندیش تھا اس نے جواب دیا پریشان ہونے کی بات نہیں آپ کے سر میں جتنے بال ہیں تھوڑی دیر میں سب آپ کے سامنے گرنے والے ہیں ان کی تعداد آپ خود معلوم کر لیجیے گا ؟ اسی طرح ہم سمجھتے ہیں کہ جب کوئی نومولود طفل عدم سے عالم وجود میں آتا ہے تو خود بخود پتہ چل جاتا ہے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی HE ہے یا SHE اس کے لئے کسی آلہ کی کیا ضرورت ہے۔

اور جہاں تک ہمارے ہندستان جنت نشان کا تعلق ہے یہ انگریزی آلہ بالکل بیکار ہے اور اس کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ ایک کفایت شعار آدمی اس سے اپنے لڑکے کی تعلیم کا خرچ نکال سکتا ہے، یا پھر لڑکی کا جہیز تیار کر سکتا ہے !

لہٰذا گذارش ہے کہ یہ آلہ انگلستان والوں ہی کو مبارک ہو ہم آج تک اس کے بغیر کام چلاتے رہے ہیں اور آئندہ بھی چلاتے رہیں گے۔

۱۷ اپریل ۱۹۶۲ء

O

انگریزوں کے زمانے میں دفتری تساہل کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں مثلاً ایک دفتر میں آگ لگ گئی حسبِ معمول عہدیداران بالا کو اطلاع ہوئی۔ کارروائی کا آغاز ہوا، مثلیں بنائی گئیں۔ تجویزیں ہوئیں، مراسلے ادھر سے ادھر پہنچتے رہے اور آخر یہ حکم صادر ہوا کہ آگ فوراً بجھادی جائے۔ اس پورے واقعہ میں غور طلب بات صرف یہ ہے کہ آگ بجھانے کا یہ حکم اس وقت نافذ ہوا جبکہ سابقہ دفتر کی خاکستر پر دوسری عمارت تعمیر ہو چکی تھی !

اب ہمارے چیف سکریٹری صاحب نے دفتریت کی ایک اور مثال پیش فرمائی ہے جسے سن کر ہم دنگ ہوتے ہوتے رہ گئے۔ موصوف نے ریاست مدراس کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ایک پست قد عہدیدار کو پائیدان کی ضرورت پڑی اور اس کی کارروائی چلی تو منظوری آتے آتے چھ ماہ لگ گئے لیکن جب ان پستہ قد عہدیدار تک یہ خوشخبری پہونچی کہ وہ پائیدان خرید سکتے ہیں اس وقت وہ نہایت اطمینان اور آرام سے بسکٹوں کی ایک پیٹی سے پائیدان کا کام لے رہے تھے اور ہر ضرورت سے بے نیاز ہو چکے تھے۔

دفتریت ہمارے یہاں کی ایک ایسی رسم ہے جسے ہم آسانی سے ترک نہیں کر سکتے اور اس کی وجہ سے نہایت دلچسپ واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمارے ایک دوست قسم کھا کر بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان کے گھر میں چوہوں کی آبادی بڑھ گئی تھی، انہوں نے محکمہ متعلقہ کو توجہ دلائی۔ چنانچہ حسب ضابطہ اور حسب معمول کارروائی شروع ہوئی اور اس نے اتنا طول کھینچا کہ جب لوگ چوہے پکڑنے کے لئے ان کے گھر پہونچے تو خود ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

ان مثالوں میں مبالغہ سہی لیکن دفتریت کا طول امل بہر حال مسلم ہے!

۳۱ مئی ۱۹۶۲ء

○

علامہ اقبال نے تو ایک دوسرے ہی سلسلہ میں فرمایا تھا کہ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

گویا اس قول کی صداقت کا عملی ثبوت شولاپور کی ایک خاتون نے دیا ہے۔ سنا ہے کہ موصوفہ کے بطن سے تیسری بار توام (جڑواں) بچے پیدا ہوئے۔ اس طرح آپ تین دفعہ کی محنت میں چھ بچوں کی ماں بن گئیں اور خدا کے فضل سے یہ تمام بچے صحت مند ہیں!

افزائش نسل کے سلسلہ میں زمین کی یہ زرخیزی باعث فخر بھی ہو سکتی تھی لیکن افسوس

ہے کہ ہم آجکل کچھ ایسے حالات سے گذر رہے ہیں کہ اکثر مسرتیں بھی ہمارے لئے وجہ زحمت بن جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر اسی واقعہ کو لے لیجئے اور فرض کیجئے کہ اگر ہمارے یہاں کی تمام خواتین بہ یک وقت دو بچے پیدا کرنے کا تہیہ کر لیں اور اپنے اس عہد پر قایم رہیں تو کثرتِ آبادی کا مسئلہ جو آج بھی کافی نازک ہے کتنا تشویشناک بن جائے گا۔

آج تو خیر ہم فیملی پلاننگ وغیرہ کے ذریعہ سے کسی نہ کسی طرح کام چلا رہے ہیں، لیکن خدانخواستہ اگر ہر ہونے والی ماں ایک نہ شد دو شد کو اپنا نصب العین بنا لے تو پھر ہم پر وہی کیفیت طاری ہو جائے گی جس کی نسبت جگر مرحوم نے اپنی زبان سے یوں فرمایا تھا ؎

کس طرف جاؤں کدھر دیکھوں کسے آواز دوں
اے ہجومِ آدمیت جی بہت گھبرائے ہے

مندرجہ بالا خبر کا یہ پہلو بھی کافی توجہ طلب ہے بلکہ پریشان کن ہے۔

جوڑے کی شکل میں پیدا ہونے والے یہ چھپکے چھوٹے بچے بالکل صحت مند ہیں ہم اپنے ملک میں صحت اطفال کا بلند معیار دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی صحت مند بچوں کی پرورش جتنی گراں ہوتی ہے وہ بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ ظاہر کہ یہ نصف درجن صحت مند بچے پہلے تو دودھ کی کافی مقدار اپنے استعمال میں لائیں گے اور جب اللہ تعالیٰ انھیں دانت دے گا تو غلہ اور دوسری اشیاء خوردنی پر اپنی صحت مندی کا حوصلہ نکالیں گے اور اس طرح زیردہ قیمتوں میں اضافہ کا سبب بنیں گے، اس لئے ملک کی ہر ہونے والی ماں کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ اپنی تخلیق کے سلسلہ میں حالات حاضرہ کو بھی پیش نظر رکھے۔

۱۲ جنوری ۱۹۶۲ء

○

ہمارا ملک تو بالکل اصلی ہے مگر افسوس صد افسوس کہ اس میں کچھ دنوں سے نقلی چیزوں کا رواج بہت بڑھ گیا ہے، نقلی گھی، نقلی آٹا، نقلی ریشم، نقلی سونا چاندی نقلی، یہاں تک کہ بعض

بعض جگہ تو دوائیں بھی نقلی ہوتی ہیں، اور استعمال کر کے مریض تندرستی پانے کے بجائے موت کے قریب ہوتے جاتے ہیں!

چونکہ ہمارا ملک اصلی ہے اس لئے ہم نقلی چیزوں کے اس طوفان کو بڑے صبر سے برداشت کرتے رہے بلکہ شکر بھی کرتے رہے کہ صاحب ضرورت کی چیزیں ہزار نقلی سہی مگر وقت پر تو مل جاتی ہیں اور یہ کہ ہم بالکل ہی محتاج نہیں ہیں، مگر حال ہی میں نیروزپور سے جو خبر آئی ہے اس نے ہمارے صبر و شکر کے پیمانے کو لبریز کر دیا ہے، تفصیلات اس خبر کی یہ ہیں کہ پولیس نے ایک شخص کا پتہ چلایا ہے، جو تقریباً ایک درجن ادارے چلاتا تھا اور یہ ان اداروں کے لوگوں کو ڈاکٹری کی نقلی سندیں دی جاتی تھیں، جنھیں حاصل کر کے وہ نقلی ڈاکٹر بن جاتے تھے، یعنی دوسرے الفاظ میں اصلی مریضوں کا تلع قمع کرنے کیلئے تیار رہتے تھے۔ اشیائے خوردنی و نوشیدنی کی حد تک تو خیر غنیمت تھا کہ اگر وہ نقلی بھی ہیں تب بھی زندگی کے لئے فوری کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے یہاں کے باشندے صدیوں سے نقلی گھی استعمال کر رہے ہیں، اور ان کی صحت اس سے یقیناً متاثر ہوئی ہے۔ لیکن وہ بہرحال زندہ ہیں)۔

اسی طرح دوسری چیزوں پر بھی قیاس کیا جا سکتا ہے لیکن جناب یہ نقلی ڈاکٹروں کا خطرہ تو اتنا شدید ہے کہ اگر اس کی طرف توجہ نہ کی جائے تو ملک الموت کی تمام سرگرمیاں ہمارے ملک میں محدود ہو کر رہ جائیں۔

آپ ہی غور فرمائیے کہ جب ڈاکٹر ہی نقلی ہوگا تو دوائیں مریضوں پر استعمال کر کے نقلی امراض پیدا کرنے کے بعد نقلی موت تک پہونچا دے گا، اور پھر جس طرح بعض سانپوں کے کاٹے کا کوئی منتر نہیں ہوتا اسی طرح اس کے علاج کا بھی کوئی وظیفہ نہیں ہو سکتا۔

خبر میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس سند فروش ادارے کے اشتہارات زیادہ تر جنوبی ہند کے اخباروں میں شایع ہوتے تھے اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ ہمارے اس علاقے میں زیادہ سے

زیادہ نقلی ڈاکٹر بنائے ہوں گے' لہٰذا اب جبکہ کسی ڈاکٹر تک پہونچنے سے پہلے پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے اور اچھی طرح تحقیق کر لینا چاہیئے کہ وہ ڈاکٹر اصلی ہے یا نقلی کہیں ایسا نہ ہو کہ ؎

ہم مسیحا جسے سمجھیں وہی قاتل نکلے

جون سنہ ۱۹۶۲ء

○

آجکل ہمارے ملک میں جہاں دوسرے بہت سے پاگل پن جاری ہیں اور عروج حاصل کر رہے ہیں' وہاں خودکشی کی وبا بھی عام ہے' لوگ محبت میں مایوس ہو کر امتحان میں ناکام ہو کر مقدمہ ہار کر روپیہ برباد کر کے بیوی یا شوہر کی بے وفائی سے تنگ آکر اور دنیا کو اپنے لئے تنگ دیکھ کر دھڑا دھڑ خودکشیاں کر رہے ہیں' کوئی محترمہ اپنے کپڑوں میں آگ لگا لیتی ہیں اور دوزخ کی طرف چلی جاتی ہیں' خودکشی بہت بڑا گناہ ہے' کوئی صاحب ریل کی پٹری پر سو جاتے ہیں اور نیند کے عالم ہی میں اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملتے ہیں کہیں دیکھا جاتا ہے کہ ایک صاحب رسی کا پھندا گلے میں ڈالے ہوئے اپنے کمرہ خواب کی چھت سے لٹکے ہوئے ہیں' اس سلسلے میں ایک زندہ دل نوجوان نے مینار پر چڑھ کر جست لگائی اور اپنے ساتھ ایک راہرو کو بھی عالم بالا کی سیر کو لیتا چلا گیا ؎

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

خودکشی کی دیوانگی کے خلاف سب سے پہلی اور سب سے قوی دلیل یہ ہے کہ جو زندگی آپ نے پیدا نہیں کی اسے ختم کر دینے کا بھی آپ کو کوئی حق نہیں رکھتے' اگر وقت نے آپ کو کچھ صدمے پہونچائے ہیں تو انھیں مردانہ وار یا محبت نسواں کے سہارے برداشت کیجئے۔ ان میں کمی کرنے کی کوشش فرمائیے اور ان پر فتح پائیے یہ کیا بقول غالب

دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اور پھر خودکشی کے جو اسباب بیان کئے جاتے ہیں وہ بعض اوقات نہایت مضحکہ خیز

ہوتے ہیں کہ ہنستے ہنستے رونا آجاتا ہے مثلاً ایک شرابی کبابی نوجوان نے کسی شریف الخاندان دوشیزہ سے عشق فرمایا، جب لڑکی والوں نے یا خود لڑکی نے شادی سے انکار کر دیا تو فوراً خودکشی کر لی یا تعلیم کا زمانہ سنیما دیکھ کر گذار دیا اور جب امتحان میں فیل ہو گئے تو سیدھے اللہ تعالیٰ کے حضور میں پہونچ گئے۔ ایک واقعہ تو یوں بھی سنا گیا ہے کہ کسی شخص نے شادی کی اور جب بیوی بدصورت نکلی تو آپ فوراً آنجہانی ہو گئے۔

۲۴ جون ۱۹۶۲ء

○

ہمارے یہاں عموماً یہ فقرہ سننے میں آتا ہے کہ آنکھیں بڑی نعمت ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ آنکھوں کی نعمت ہونے سے کوئی آنکھوں والا انکار نہیں کر سکتا اس لئے کہ اگر آنکھیں نہ ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پوری زندگی بے نور ہو گئی، اسی لئے حکماء کے ساتھ ساتھ ہمارے شعراء نے بھی آنکھوں کی اہمیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً حکما کہتے ہیں کہ ــــ فاعتبروا یا اولی الابصار یعنی اے آنکھیں رکھنے والو عبرت حاصل کرو، یا ایک شاعر کہتا ہے کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں

ان سطور کا حاصل یہ ہے کہ نظام جسمانی میں آنکھوں کا مقام بہت بلند ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم دوسرے اعضاء کی ضرورت و اہمیت کو نظرانداز کر دیں، حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے انسانی جسم کو کچھ ایسے حکیمانہ انداز سے بنایا ہے کہ ہر عضو اپنی جگہ لاجواب ہے یعنی بقول شاعر ؎

جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

شرح کلام کے طور پر دانتوں کو لے لیجئے بظاہر یہ ہڈی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بالکل بے قیمت ہیں لیکن ان کا مول ان لوگوں سے پوچھنا چاہیئے جو کسی وجہ سے اپنے دانت کھو چکے ہیں اور عرف عام میں پوپلے کہلاتے ہیں، چنانچہ جب ہم نے ایک خبر کے ذریعہ یہ معلوم کیا کہ انگلستان

میں آجکل دانتوں کے گرنے کی بیماری عام ہے، یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے اسکول جانے والے بچے بھی مصنوعی دانت لگائے پھرتے ہیں تو ہمیں بڑا افسوس ہوا اور بے ساختہ یہ پرانا مصرعہ یاد آگیا ؎

"حسرت ان دانتوں پہ ہے جو بن چبائے گھس گئے"

جہاں تک دانتوں کا تعلق ہے ہم اس فرق کو فراموش نہیں کر سکتے جو ہاتھی اور انسان کے درمیان پایا جاتا ہے یعنی ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور لیکن انسان کا معاملہ مختلف ہے وہ تو جن دانتوں کو دکھاتا ہے انہی سے کھانے پر مجبور ہے، پھر مشکل یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس لئے قدم قدم پر کوئی دوسرا اشرف المخلوقات اس سے سوال کرتا رہتا ہے کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں؟

انگلستان کے محققین نے پتہ چلایا ہے کہ دانت گرنے کی اصل وجہ زیادہ مٹھائی کھانا ہے اور چونکہ ہمارے یہاں مٹھائی کی دوکانیں بہت بڑھتی جا رہی ہیں اس لئے ہم اپنے اہل وطن کو اس نکتہ کی جانب توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

۷ر جولائی ۱۹۶۲ء

O

بنگلور میں علاج حیوانات کے موضوع پر بحث ہو رہی تھی اور ایک صاحب گدھے کی افادیت پر روشنی ڈال رہے تھے، اس سلسلے میں انہوں نے تقسیم ہند کے زمانے کا ایک واقعہ بیان کیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ہندستان اور پاکستان کے درمیان ایک گدھے کی ملکیت وجہ اختلاف بن گئی تو فیصلہ کیا گیا کہ اسے نیلام پر چڑھا دیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہندستان نے ساٹھ ہزار روپے میں اس گدھے کو حاصل کر لیا جو اب تک کسی زراعتی فارم میں موجود ہے!

ہم خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرتے ہیں کہ ہمیں گدھے کی افادیت سے انکار

نہیں ہم نے اللہ تعالیٰ کی اس مخلوق کو نہایت محنتی بے ضرر فرمانبردار، مخلص بے ریا اور مرنجان مرنج پایا ہے، اور جہاں تک اس کے ظاہر کا تعلق ہے وہ اپنے دل میں کسی کی طرف سے کینہ نہیں رکھتا کسی جماعت کا ممبر نہیں بنتا فرقہ پرستی سے بہت بلند رہتا ہے خواہ مخواہ دشمنی مول نہیں لیتا اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور فرائض متعلقہ کو نہایت تن دہی اور جاں فشانی سے ادا کرتا ہے گدھے کی ان ہی خوبیوں سے متاثر ہو کر کرشن چندر نے اس کی سرگذشت لکھ ڈالی۔

لیکن اسی اعتراف کے باوجود یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ تقسیم کے دوران میں ایک گدھے کی قیمت اتنی زیادہ کیوں ہو گئی تھی کہ اسے ساٹھ ہزار روپیہ میں خریدنا پڑا، اس لیے کہ جہاں تک ہماری یادداشت کا تعلق ہے، اس زمانے میں دونوں طرف سے بے شمار گدھے موجود تھے اور ان میں سے اکثر تو اپنے گدھے پن کا مظاہرہ علی الاعلان کرتے پھر رہے تھے! اس خبر نے ہمارے لیے ایک بہترین موقع فراہم کیا ہے، جس سے فائدہ اٹھا کر ہم معاشی نقطہ نظر سے انسان اور گدھے کا تقابلی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

افسوس ہے کہ ہمارے یہاں انسان کی یکمشت قیمت ادا کر کے خریدنے کا رواج نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو یقیناً انسان اس مذکورہ گدھے کے مقابلہ میں بہت ہی ارزاں فروخت کیا جاتا، یوں بھی چونکہ آجکل ہمارے یہاں کی قومی آمدنی فی کس پچاس روپے ماہانہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے اگر کوئی انسان ساٹھ ہزار روپے کمانا چاہے تو اُسے اپنے مقصد تک پہونچنے کے لیے سو سال درکار ہیں اور اس سلسلہ میں ایک شاعر جو انسان بھی تھا یوں کہہ چکا ہے!

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

تمنا ہے کہ کاش کبھی ہم اس زراعتی فارم تک پہونچ سکیں جس میں یہ ساٹھ ہزار روپے کا گدھا رونق افروز ہے!

۲۶ جولائی ۱۹۶۲ء

شاہد صدیقی کا آخری کالم

پڑوسی ملک پاکستان کے ہر ریڈیو اسٹیشن سے ہندستانی فلموں کی موسیقی کے ریکارڈ بجتے رہتے ہیں بہت دن تک تو وہاں کے حضرات و خواتین اور شائقین و سامعین انھیں بغیر کسی پس و پیش کے نہایت لطف و مسرت کے ساتھ سنتے رہے لیکن ادھر کچھ دنوں سے بعض شدید وطن پرست پاکستانیوں میں یہ احساس پیدا ہو چلا ہے کہ یہ فلمی موسیقی جو براڈ کاسٹ ہو رہی ہے چونکہ ہندستانی ہے اس لئے اسے بند ہونا چاہیئے اور اس کے بجائے پاکستان کے فلمی گیت ریڈیو سے نشر ہونے چاہئیں !

وطن دوستی بہت اچھی بات ہے اور ملکی مصنوعات کی قدر کرنا اس کا عملی مظاہرہ ہے اس لئے ہم پاکستانی دوستوں کی اس خواہش کا احترام کرنے پر مجبور ہیں کہ وہاں کی نشریات میں پاکستانی ریکارڈ ہی شامل ہونے چاہیں لیکن اس کا علاج ہمارے پاس تو در کنار شاید لقمان کے پاس بھی نہ ہوگا کہ پاکستانی فلمی نغمے ہندستانی فلمی نغموں سے اتنے ہی پیچھے ہیں جتنی کہ خود پاکستانی فلم انڈسٹری ہماری صنعت فلم کے مقابلے میں (BACK WARD.) ہے اور یہ نکتہ تو پاکستان والوں کو معلوم ہونا ہی چاہیئے کہ فنون لطیفہ کے سلسلہ میں ملکی غیر ملکی یا پاکستانی اور ہندستانی کی منطق بالکل نہیں چل سکتی جیسا کہ حضرت جامی مغفور نے فرمایا ہے ؎

اندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

ہم بغیر تعصب کے عرض کرتے ہیں کہ پاکستانی فلم انڈسٹری نے اب تک جو گانے پیش کئے ہیں ان میں ایسے بہت ہی کم ہیں جو بین الاقوامی سطح پر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں بلکہ ہمارے حافظہ میں تو صرف دو پاکستانی فلمی ریکارڈ ایسے ہیں جنھیں کچھ اہمیت حاصل ہے ان میں سے ایک یہ ہے ۔

پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے

اور دوسرا کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے گویا اسے خاکسار تحریک کے کسی شاعر نے لکھا ہو۔

ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

دوسری جانب لاتعداد ہندستانی فلمی ریکارڈ دلکشی اور تاثیر کی اس منزل تک پہونچے ہوئے ہیں جہاں انھیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا مثلاً ملاحظہ ہو۔

موہے پنگھٹ پہ نند لال چھیڑ گیو رے۔

جب پیار کیا تو ڈرنا کیا

چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو

بھونرا بڑا نادان

احسان ترا ہوگا مجھ پر

ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دل ابھی بھرا نہیں

اور یہ کہ

دادی اماں، دادی اماں مان جاؤ

وغیرہ وغیرہ

اس لئے ہماری رائے میں مناسب یہی ہے کہ پاکستانی اہل ذوق اس معاملہ میں ضد نہ کریں اور یہی بات مان جائیں۔

فلمی گانوں کی بات چل پڑی ہے تو یہ خبر بھی سن لیجئے کہ کچھ دن پہلے بھوپال کے قریب ایک ڈاکو پولیس کا مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہو گیا جب اس کے مکان کی تلاشی لی گئی تو سامان نوشت وخواند میں ایک ڈائری بھی نکلی۔ جس میں اسلحہ کی تفصیلات کے ساتھ کئی فلمی گانے بھی لکھے ہوئے تھے پروفیسر کلیم الدین نے غزل کو وحشی صنف سخن قرار دیا ہے اگر وہ اس واقعہ سے واقف ہو جاتے تو اپنی رائے بدل دیتے اور غزل کی بجائے فلمی گانوں پر وحشی صنف ہونے

کا الزام لگاتے جو ڈاکوؤں کی ڈائری میں لکھے ہوئے پائے جاتے ۔

یکم اگست ۱۹۶۲ء

"قصہ درویشاں"

دکوبکن مرحوم اتوار کا کالم بڑے اہتمام سے لکھا کرتے تھے۔ اس دن عموماً ان کی کوئی پیروڈی شائع ہوا کرتی تھی لیکن درمیان میں چند دنوں تک انہوں نے "درویشوں کے قصے" کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جو قارئین میں بے حد مقبول ہوا تھا۔ یہ سارے قصے دلچسپ تھے جن میں سے چند کا انتخاب یہاں کیا گیا ہے)

شکر نامہ

(آغا حشر کاشمیری سے معذرت کے ساتھ)

چھٹے درویش نے جو کثرت غم سے نڈھال تھا اپنی سرگذشت یوں شروع کی۔

سنو اے دوستو میری کہانی
نہایت مشکل میں گذری زندگانی
نہ میرا کوئی دادا ہے نہ دادی
نہ میرا کوئی نانا ہے نہ نانی

اے محبانِ کرام اور اے عزیزانِ ذی احترام یہ ناچیز رہنے والا شہر مظفر آباد فرخندہ بنیاد کا ہے جو ہفت اقلیم کے درمیان واقع ہے اور وزیر با تدبیر جہاں کے تمام اشیاء کو خوشحالی سے تعبیر کرتے ہیں اور جب شکر کا قحط پڑ جاتا ہے تو بغیر شکر کی چائے پلانے کی تدبیر کرتے ہیں۔ میں کہ فلک ناہنجار کا ستایا ہوا ...... غم ہائے روزگار کا ... ہوا آفات ارضی کا گھرایا ہوا اور معاشات سماوی کا ستایا ہوا تھا۔ جب اس شہر میں پہونچا تو ایک سرائے میں

مقیم ہوا۔ دل رنج و غربت سے دو نیم ہوا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ بھٹیارن اس سرائے کی
نہایت شوخ و شنگ ہے۔ مگر غذا کا کچھ اور ہی رنگ ہے۔ اپنے آبا و اجداد کی عزت کو
درمیان میں لاکر کہتا ہوں کہ تین دن تک شکر کا ایک دانہ بھی اڑ کر میرے منہ میں نہیں گیا۔
اور ضعف اور نقاہت کا یہ عالم ہو گیا کہ جب بھی شکر کا خیال آتا تھا رال ٹپکنے لگتی تھی۔
اور باشندے اس شہر کے اسے برتنوں میں بھر لیتے تھے اور کل کی ضرورت رفع کرنے
کے لئے احتیاط سے جمع کر لیتے تھے، میں نے اس شہر میں یہ بھی دیکھا کہ لوگ شکر کی قلت
سے پریشان تھے۔ لیکن وزرا وہاں کے نہ خبردار تھے نہ سر در گریباں تھے۔ ان میں سے
ایک وزیر نے جو سمندر کے کنارے سے آیا تھا جس کا رعب ربع مسکون پر چھایا ہوا تھا۔ شہر
مذکور کے رہنے والوں سے کہ عرف عام میں انھیں خبطا کہتے ہیں۔ یہ خواہش کی کہ بغیر شکر کی چائے
پئیں اور بہت دن جئیں۔ لیکن جب اس تدبیر پر عمل کیا گیا تو نتیجہ بالکل الٹا نکلا۔ یعنی جو لوگ
ہٹے کٹے تھے دیکھتے دیکھتے ان کا جنازہ نکلا۔ اے بھائیو، اللہ تعالیٰ نے جس کے قبضہ قدرت
میں ہم سب کی جان ہے جو ہم سب پر بہت مہربان ہے۔ انسان کو شکر کا کیڑا بنایا۔ اور پھر اسے
دنیا میں مسند خلافت پر بٹھایا۔ اگر دو دن شکر نہ ملے تو خون آدمی کا پانی ہو جائے۔ اور
دیکھنے والوں کو حیرانی ہو جائے۔ لیکن آفریں ہے اس شہر کے رہنے والوں پر کہ شکر انھیں بالکل نہیں
ملتی تھی، لیکن ان کے دل کی کلی کھلتی تھی۔ جب وہ احتجاج کی آواز اٹھاتے تھے تو ہر کہ
و مہ سے واہ پاتے تھے۔ بچے ان کے پھیکا اور بد مزہ دودھ پی کر ایڑیاں رگڑنے لگے۔ حکومت
کے کارندوں نے جب یہ منظر دیکھا تو فخر سے اکڑنے لگے۔

تجربہ یہ ہوا کہ اہلیان شہر مذکور دودھ میں اور چائے میں نمک ملانے لگے اور نمک ہی سے
قلاقند اور برفی بنانے لگے۔ جب یہ مٹھائیاں وزرا نے کھائیں تو شدت مسرت سے خوب
بغلیں بجائیں۔

آخر کار میں اس شہر سے نکل کر ستیان پہونچا جہاں سیمرغ کا آشیانہ تھا۔

۱۰ ستمبر ۱۹۵۹ء

○

پھر چھٹے درویش نے پانچویں درویش کی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بصد حسرت و اندوہ اپنی داستانِ غم یوں شروع کی ہے۔

یارو خدا کے واسطے میرا بیاں سنو
قصہ ہے بے نیاز چنیں و چناں سنو
سینے پہ ہاتھ رکھ کے میں کہتا ہوں اپنا حال
تم اپنا سر پکڑ کے مری داستاں سنو

اے عقلمندانِ عالی مقام اور اے درویشانِ ذوی احترام یہ سیہ بخت رہنے والا کشورِ نشاپور کا ہے اور عجب حال اس رنجور کا ہے، والد میرے ایک مسجد میں موذن تھے مرضِ ہیضہ سے راہیِ ملکِ بقا ہوئے اور زن و فرزند سے جدا ہوئے، جب سایۂ یتیمی کا میرے سر پر پڑا تو فلکِ ناہنجار نے میرے گال پر ایک طمانچہ جڑا، ناچار تلاشِ روزگار میں کہ ذریعہ قوت لایموت کا ہے آوارہ و بے خانماں ہوا اور باشارۂ غیبی سے مدھیہ پردیش کی جانب رواں ہوا، وہاں ایک عمارت دیکھی جس کی بناوٹ سقفِ فلک کا منہ چڑاتی تھی جو عرفِ عام میں اسمبلی کہلاتی تھی، کچھ لوگ میری ہیئت پر رحم کھا کر اندر لے گئے دیکھا کیا ہوں کہ اس تعمیرِ دلپذیر کے اندر بھانت بھانت کے نمائندے موجود ہیں، جن میں سے کچھ جامد ہیں کچھ محسود ہیں۔ پھر یکایک یوں محسوس ہوا کہ گویا قیامت آگئی اور بلوہ و فساد کی نوبت آگئی ہے۔ ایک شخص نے کہ بظاہر منچرفارغ التحصیل معلوم ہوتا تھا مسودہ قانون کی کاپی پھاڑ ڈالی گویا حاضرین کے دل کی دنیا اجاڑ ڈالی،

اے عزیزانِ باوفا بہ حلف شرعی عرض کرتا ہوں کہ اس وقت میری روح قالب سے نکلنے لگی اور اپنی منزل پر پہونچنے کے لئے مچلنے لگی۔ اتنے میں ایک مردِ ذی وقار نے حکم دیا یہ شخص کہ ذرہ بر جو شر انگیز ہے اور جس کی نقل و حرکت فتنہ انگیز ہے ایوان سے

نکال دیا جائے اور اگر خوشی سے نہ نکلے تو ہاتھوں ہاتھ اچھال دیا جائے۔ جس پر ایک مرد قد آور جس کا نام مارشل تھا اور جو دیکھنے میں پیغام اجل تھا' آگے بڑھا اور خطاکار کو تین پہلوانوں کی مدد سے باہر کیا ؎

میں نے کہا کہ بزم ناز غیر سے چاہیے تہی
ہنس کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اے عزیزان باصفا اس واقعہ کا میرے دل پر بہت اثر ہوا اور میں خستہ و خوار در بدر رہا یہاں تک کہ گردشِ تقدیر مجھے ماوراالنہر کے علاقہ میں لے گئی۔ یہاں کے باشندے بہت بہادر کہلاتے ہیں اور جب کسی شخص سے جھگڑا ہو جاتا تو فوراً گولی چلاتے ہیں' میں یہاں کابل چھ مہینہ اور گیارہ دن رہا' اور مقامی درویشوں سے کہ راہ فنا کے مالک تھے اور کئی عالیشان محلات کے مالک تھے۔ کسب فیض کیا' آب و ہوا اس مقام کی بہت خوب ہے۔ اسی لئے یہ جگہ بڑی بڑی قوتوں کو مرغوب ہے۔ یہاں کے لوگوں کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی مسئلہ پر تصفیہ نہیں کر سکتے۔ اور جب اختلافِ خیال پیدا ہوتا ہے تو دوسروں کا منہ تکتے ہیں' پھر میں ایسی جگہ پہونچا جہاں کے لوگ انگریزی کو ہٹانے میں مصروف ہیں' ان میں سے اکثر گمنام ہیں اور چند مشہور ہیں' طریقہ ان کا یہ ہے کہ کمیلن کے نام سے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں' کبھی ہنستے ہیں اور کبھی روتے ہیں' تماشائی انھیں دیکھ کر عبرت پکڑتے ہیں اور جو نافہم ہے وہ خواہ مخواہ اکڑتا ہے۔ یہ لوگ خداداد صلاحیت کی بنا پر سخن فہم و سخن شناس ہیں' یعنی صحیح بیانی ان کے پاس ہیں' ان میں سے اکثر ردیف کو قافیہ سے چپکاتے ہیں اور مشاعروں میں داد پاتے ہیں' اس فقیر کو بھی ایک مشاعرے میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا اور پھر اس محفل سے اٹھنا سخت شاق ہوا۔ لیکن شومئی قسمت فقیر کے جوتے سرقہ ہو گئے۔

۱۱ / اکتوبر ۱۹۵۹ء

○

چھٹے درویش پر پانچویں درویش کی داستان سن کر رقت طاری ہوگئی اور اس کی آنکھوں سے جوئے اشک جاری ہوگئی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی آسمان کی طرف نگاہ کی اپنا گریباں پھاڑا پھر وہ شیر کی طرح دھاڑا' اور فی البدیہ یہ شعر پڑھا ۔

کہاں لے جاؤں دل دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے
ادھر پریوں کا مجمع ہے' ادھر حوروں کی محفل ہے

اے دوستو یہ تنگ آفرینش اور بے بہرہ دانش و بینش باشندہ شہر بھاگ نگر کا ہے پھر بھی لوگ پوچھتے ہیں کہ تو رہنے والا کدھر کا ہے ! ایک زمانے تک اسی سیدان نے قانون سے جی بہلایا اور جب اس سے بھی پیٹ کی آگ نہ بجھی تو قیادت کی مسند پر قبضہ جمایا' اس زمانے میں دستور العمل اس فقیر کا یہ تھا کہ مذہب کے نام پر لوگوں کو جمع کرتا اور دلوں میں ان کے نفرت کا زہر بھرتا' اس سے دو فائدے ہوئے ایک تو یہ کہ مجھے خورد و نوش کی طرف سے فارغ البالی نصیب ہوئی اور دوسرے یہ کہ میرے فرزند کو بھی لیڈری کی مسند عالی نصیب ہوئی ۔ طریقہ میری قیادت کا یہ تھا کہ سیدھے سادے لوگوں کو جنھیں عوام الناس کہا جاتا ہے اور جنتا کا نام دیا جاتا ہے' اپنی تقریروں کے ذریعہ ڈراتا تھا' اور اس طرح جو رقم جمع ہوتی تھی اسے اپنے گھر لے جاتا تھا' میں نے جس حجرے میں اپنی قیادت کی مسند بچھائی تھی اور لیڈری کی دوکان سجائی تھی اس کے چاروں طرف حصار کھینچ دیا تھا گویا مخالفین کو بر سر دار کھینچ دیا تھا !

لیکن شومئی بخت میری اس عالم میں رنگ لائی یعنی جو لوگ عقل سلیم رکھتے تھے ۔ انہوں نے میرے ماننے والوں کو نئی راہ دکھائی جب مجھ سے پوچھا گیا کہ میری قومی خدمات کیا ہیں تو میں بغلیں جھانکنے لگا اور میرا فرزند بھی میری ہمنوائی میں گیں ہانکنے لگا ۔ اس مصیبت و پریشانی کے عالم میں کہ عقل میری کام نہیں کرتی تھی میں نے انتہائی خشوع و

خضوع کے عالم میں دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے اور زبان پر یہ الفاظ آئے کہ "اے خدا میری قیادت جو کہ میرا ذریعہ معاش ہے، جاری رکھ اور میری آمدنی میں استواری رکھ"، لیکن وائے بر حال ما کہ جیسے جیسے لوگوں میں خلق آتی گئی ہوشیاری ان کی میری لیڈری کو پیچھے ہٹاتی گئی جن لوگوں نے مجھے چندے دئیے انہوں نے حساب مانگا، مگر چونکہ مختلف جگہ سے آئی ہوئی رقمیں خرچ ہو چکی تھیں اور میرے ہوش وحواس کو بھی کھو چکی تھیں اس لئے میں حساب دینے پر آمادہ نہ ہوا اور حق وصداقت کا دلدادہ نہ ہوا۔ اس سے لوگ کہ پہلے ہی سے جھلائے بیٹھے تھے بلکہ خار کھائے بیٹھے تھے آپے سے باہر ہوگئے مجھے قیادت کی مسند سے ہٹا دیا اور اس تکیہ میں کہ جائے پناہ درویشوں کی ہے، لاکر بٹھا دیا اب میں گوشہ تنہائی میں اس دولت کو یاد کرتا ہوں جو میرے ہاتھ سے نکل گئی اور سوچتا ہوں کہ دنیا کتنی جلدی بدل گئی۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۵۹ء

○

ساتویں درویش نے اپنی داستان سنانے سے پہلے ایک دردانگیز آہ کی، اور پھر چشم حسرت دیا س آسمان کی جانب نگاہ کی شعلہ جو اس آہ کا بلند ہوا تو حاضرین مجلس نے اپنے اپنے سگریٹ جلا لئے یعنی ماچس کے پیسے بچائے، اس پر ساتویں درویش کو جو تاؤ آیا تو اس نے "یا ہو" کا نعرہ لگایا، اور سب کو ہمہ تن گوش پا کر یوں گویا ہوا۔

سن سن، اے بھائی سن ⁂ میں نے سیکھے کتنے گن
تیری دنیا میں چار بنو لے ⁂ سب سے پہلے ان کو چن

اے عزیزان با تمیز میں رہنے والا کوہ ہمالیہ کا ہوں، جو ہندستان جنت نشان کے ایک کنارے پر خط استوا کو قطع کرتا ہے، اور خط سرطان جس کے نیچے سے گذرتا ہے، آباواجداد میرے درۂ لیولان کو عبور کرتے ہوئے اس قلمرو میں داخل ہوئے اور اس وقت جو حکمراں تھے انکے مصاحبین میں شامل ہوئے میرے دادا کو جنتوں نے بادشاہ کے دئے ہوئے

مصرعہ پر مصرعہ لگایا تھا، اور اپنی بدیہہ گوئی سے حاضرینِ دربار کو شرمایا تھا۔

ڈیڑھ پارچہ کا خلعت عطا ہوا، گویا نشانِ عظمت و دولت عطا ہوا، ایک زمانے تک سارے خاندان کے افراد سیر و شکار اور شعر و شاعری سے دل بہلاتے رہے، بلکہ ان میں سے بعض تو سرِ بازار ناچتے اور گاتے رہے، لیکن پھر فلک کینہ جو نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا جس نے ہم سب کا کلیجہ چھید ڈالا۔ گردشِ چرخ سے ہماری تو کی شام ہوئی، یعنی صبح عیش و عشرت کی شام ہوئی، جب میرے اہلِ خاندان اس امارت سے گر گئے اور حویلیوں گدھے کے ہل پھر گئے تو اس ننگِ خاندان نے کہ میٹرک کامیاب تھا اور بے تکلف دوستوں میں چنو میاں جس کا خطاب تھا سرکاری ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی سب نے اس کی ستائش کی لیکن دفتروں کے دروازے اس حقیر پر بند تھے اور جو لوگ اندر بیٹھے تھے وہ شاد و فرسند تھے، نوبت یہاں تک پہونچی کہ جی میرا زندگی سے اُچٹ گیا اور میں ایک فٹ پاتھ پر آرام سے سو گیا، خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صحرائے لق و دق ہے جس کی ہیبت سے منہ رستم و سہراب کا فق ہے۔ درمیان میں اس صحرائے ناپیدا کنار کے ایک بزرگ کوٹ پتلون پہنے کھڑے ہیں جو مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں اور عقل میں بڑے ہیں، ان بزرگوار نے حالتِ غیض و غضب میں کہ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں، اور نظریں دم بدم رنگ بدل رہی تھیں مجھ سے کہا کہ اٹھ اور اپنے دادا کا ڈیڑھ پارچہ والا خلعت بازار میں بیچ ڈال، یعنی دل سے تمام وسواس شیطانی کو نکال!

ناچار میں نے تعمیلِ حکم پر کمر باندھی اور زرِ فروخت سے اس خلعت کے جو تین روپے چھ آنے ملے تھے اِن کے بھروسے پر نیتِ سفر باندھی۔

قسمت کی یاوری مجھے اس حلقۂ درویشاں میں لے آئی اور میں نے زندگی کی مراد پائی یہاں ایک تولہ افیون روز ملتی ہے اور جس کے استعمال سے دل کی کلی کھلتی ہے۔

۲۵ر اکتوبر ۱۹۵۹ء

آٹھویں درویش نے کہ جو سب سے زیادہ کم دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ تھا۔ شیروانی کے
دامن سے اپنی عینک کو صاف کیا۔ ڈبیہ میں سے ایک پان نکال کر کھایا اور پھر حاضرین پر نظر
ڈالتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا :-

سننے والو مرا بیان سنو ۔ کسی شاعر کی داستان سنو

اے صاحبان عزیز اے محبان باتمیز یہ برگشتہ بخت رہنے والا شہر کھڑک پور کا ہے کہ عرف
عام میں اسے رسالہ عبداللہ کہتے ہیں'

میرے والد بچپن میں لکڑیاں جمع کرتے تھے' اور ان کے بال بچے بھوکے مرتے تھے' میں نے
جب گھر میں کھانے کو نہ پایا' تو اپنا وطن چھوڑ بیراگ نگر چلا آیا کہ ہمالیہ کی ترائی میں واقع ہے اور
جس کی آب و ہوا عوام و خاص کے لئے نافع ہے۔ اس شہر کا بیان میرے لئے حیطۂ حط المکان
سے باہر ہے۔ سڑکیں مصفا عمارتیں لاجواب' بازار پر رونق اور دلوں میں پیچ و تاب' حسینان
مہ جبیں کی اس شہر میں کوئی کمی نہ تھی اور ابھی تک میری نظر اچھی طرح جمی نہ تھی' تصلف سالی سے
یہاں بھی ایک حسینہ پر جو میرے ایک شناسا کے گھر میں رہتی تھی' عاشق ہو گیا لیکن فلک کم بین
مجھ سے ناموافق ہو گیا' جب صدمہ ہجر کا حد سے بڑھا تو میں نے شعر گوئی کا آغاز اور اس
پری رو سے ملنے کی خاطر دست و دشمن سے ساز باز کیا لیکن افسوس کہ جب میں نے اپنے
اشعار اس شہر کے عالموں اور داناؤں کو سنائے تو انہوں نے کوئی معنی نہ پلٹے' ناچار میں نے
شاعری سے توبہ کرنی چاہی اور چونکہ کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اس لئے آنتوں کے ساتھ قل ہو اللہ
پڑھنی چاہی

اس شہر کے ایک نیک نیت اور ایک خوش خصلت امیر کی نظر مجھ پر پڑی اور میری
فر بھی بہت پسند آئی۔ طویل مدت تک میں اس کے سائے میں زندگی بسر کرتا رہا۔ اول' اول
بک بک کر کے اپنا پیٹ بھرتا رہا۔ یہاں میرا کام صرف یہ تھا کہ اچھے خاصے بامعنی شعر کو
بے معنی بنادوں اور باتوں کے طوطا مینا اڑاؤں۔ اس خدمت کے معاوضے میں مجھے روزانہ

ساڑھے تین سو چپاتیاں، اور ایک مرغ مسلم ملتا تھا، جس کی خوشبو سے میرے دل کا کنول کھلتا تھا۔

اے یارانِ محترم، اے بزرگانِ مکرم جب پیٹ چوہوں کی دوڑ سے محفوظ ہوا، تو میری آنکھیں کھلیں، اور میں استادی کا نعرہ لگایا۔ اور بعض سادہ لوح لوگوں کو اپنا شاگرد بنایا، لیکن ہائے قسمت کہ جیسے جیسے میری شاعری کا رنگ اُڑتا گیا۔ شاگردوں کا منہ میری طرف سے مڑتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دن سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ گویا میری استادی کی گردن توڑ کر چلے گئے۔ اور میں ایک صحرائے لق و دق میں تنہا کھڑا رہ گیا۔ یا یوں سمجھئے کہ بے یار و مددگار پڑا رہ گیا۔ آخر انسان خطا و نسیاں کا پتلا ہے کب تک ایک جگہ رہ سکتا ہے چنانچہ مشیت الٰہی مجھے بھی یہاں سے ایک جگہ لے گئی۔ اس نئے شہر کا نام مرزنجان تھا، اور والی وہاں کا کوئی خاقان تھا۔ اِس صاحب ہمت نے کہا کہ عاشقی سے توبہ کر میں پاس بٹھاؤں گا ان الفاظ کے ساتھ اس کے قدموں پر گرا اور عاشقی کے ساتھ ہی شاعری سے توبہ کی! ـــ اے دوستو، اے ہمہ موجب میرا یہ ذریعہ معاش ختم ہو گیا اور قوت لایموت کا کوئی وسیلہ باقی نہ رہا تو میں ایک جھیل کے کنارے جا کر بیٹھ گیا اور مچھلیوں کو پکڑنے کا عمل شروع کیا، طریقہ میرا یہ تھا کہ میں رات کو کاغذ پہ ایک دعا لکھ کر جھیل میں ڈال دیتا تھا اور صبح کے وقت مچھلیاں میرے دروازے پر دستک دیتی ہوئی نظر آتی تھیں، لیکن میرا یہ انداز اس شہر کے محکمہ سمکیات کو ناگوار گذرا اور اس نے میرے خلاف کارروائی کی جو آج تک جاری ہے۔

۲۹ر نومبر ۱۹۵۹ء

○

فواں درویش پہلے دو زانو ہو کر بیٹھا پھر نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ چار زانو ہو گیا، داڑھی پر ہاتھ پھیرا، مونچھیں درست کیں ایک ٹھنڈی سانس لی اور حق اللہ کا نعرہ لگا کر یوں گویا ہوا ؎

یارو سنو فسانہ دلِ بیقرار کا ؛ مجھ کو ستا رہا ہے الم روزگار کا

جو پہلے ایک محل تھا اب جھونپڑا بنا ہوا ہے۔ میں رہنے والا ہوں اسی اجڑے دیار کا

اے استادانِ سخن فہم اور ملے نقرار! راجب الرحیم یہ گناہگار غریب الدیار جو اس وقت آپ کے سامنے اچھا بھلا بیٹھا ہے نالک کج رفتار کا ستایا ہوا اور زمین شور کا بہکایا ہوا ہے طبیعت میں اس خاکسار کی بچپن ہی سے ایک شوریدگی تھی یعنی اوباشوں کی محبت میں جی لگتا تھا اور شریفوں سے بیزار گی تھی۔ جب والد مرحوم اس ناچیز کے رہ نوردِ عالم جاودانی ہوئے تو حواس میرے مائل بہ پریشانی ہوئے محلہ والوں کے سب کے سب میری حرکتوں سے بیزار تھے۔ اور ہمیشہ در پے آزار تھے مجھے پکڑ دھکڑ کر ایک مکتب میں بٹھا دیا اور طالب علموں میں میرا نام لکھا دیا لیکن یہ نا سمجھے کہ اس تدبیر سے میرا جنون کم ہوا بلکہ دل کا کچھ اور ہی عالم ہوا ایک دن جب کہ میرے استادانیوں کے نشہ میں مدہوش اندرے بے جان اور با ہر سے سرا پا جوش بنے بیٹھے تھے میں ان کی آنکھ بچا کر بھاگ نکلا اور صحرائے گوبی میں جا پہنچا وہاں میری ملاقات ایک بزرگ سے ہوئی جنہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا مانگ کیا مانگتا ہے میں شدتِ رعب سے بے ہوش ہو گیا اور اسی عالم میں گہری نیند سو گیا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دربار آراستہ ہے اور ایک مردِ وجیہہ تخت پر متمکن ہے۔ میں اس کی خدمت میں کئی سال رہا مشغلہ میرا یہ تھا کہ جب وہ امیر خوش تدبیر مجھ سے کوئی چیز قیمتاً منگاتا تو میں اس میں سے کچھ نہ کچھ پیسے ضرور بچا تا میں اس کی بیگم کو بھی اپنے قریب میں لے آیا اسے دھوکہ دے کر پانچسو روپیہ کھا گیا۔ اور رفتہ رفتہ اس کے سارے کاموں پر چھا گیا۔ آقا میرا بڑا نیک اور فیاض انسان تھا اور اہلِ علم فضل کا قدرداں تھا۔ میں نے اسے دوسرے راستے پر لگا دیا۔ اور چند آوارہ لڑکوں کو رقص دکھایا تس پر بعض لوگوں نے مجھے ٹوکا اور اس بے ایمانی سے روکا میں ان کی باتوں میں نہ آیا اور جتنا کما سکتا تھا کمایا۔ لیکن اے دوستو پھر میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک تالاب کے کنارے میں بے حس و حرکت پڑا ہوا ہوں جسم میں اتنی طاقت نہیں کہ اٹھ سکوں اور نہ دو گھونٹ پانی پیوں کہ قدرت نے انسان کو غذا کا

کیڑا اور پانی کا حشرات الارض بنایا ہے۔ اس نوبت پر پہونچ کر نویں درویش کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے ایک بیڑی اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں میں دبائی اور اتنی زور سے کش لیا کہ شعلہ اس بیڑی سے نکل کر دسویں درویش کے لباس پر جا گرا، بہ مجرد گرنے کے دسواں درویش دھڑا دھڑ جلنے لگا، اور زور زور سے کف افسوس ملنے لگا۔ نویں درویش نے جب یہ عالم دیکھا تو غش کر گیا۔ لوگ سمجھے کہ مر گیا۔ لیکن درحقیقت ایک قسم کا منفی عمل تھا۔ نواں درویش جس کا فاعل اجل تھا تب جتنے درویش تھے، نویں درویش کا کمال دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو پریشان رہ گئے۔ پھر نواں درویش اپنے عمل سے مرغابی بن کر تالاب میں تیرنے لگا دوسرے درویشوں پر بڑی ہیبت طاری ہوئی اور نویں درویش کا مقابلہ کرنے کی تیاری ہوئی۔ اِن میں سے ایک درویش نے جال بن کر پکڑنا چاہا پھر جال اور مرغابی ایک جان دو قالب ہو گئے۔ راویان شیریں زبان اور ناقدین کج بحث بیاں لکھتے ہیں کہ جب ایک درویش مرغابی بن جائے اور دوسرا درویش جال بن کر اس کے ساتھ رہے تو قہر خداوندی کا نازل ہونا ضروری ہے۔ اور اِس سے انکار کرنا بے شعوری ہے کہ جو لوگ آثار قیامت پر گہری نظر رکھتے ہیں وہ بھی یہی وظیفہ شام بھر رکھتے ہیں۔

۶ر ڈسمبر ۱۹۵۹ء

O

جانا دسویں درویش کا کوہ ندا کی جانب اور واپسی میں دیکھنا کرکٹ کا

دسواں درویش رو بہ قبلہ ہو بیٹھا اور سلگتی ہوئی بیڑی اپنے داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں میں دبا کر دھواں چھوڑنے لگا، جس سے باقی ماندہ درویشوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے اس کے بعد وہ یوں گویا ہوا 'اے محبوب اے دوستو جب یہ ننگ آفرینش اور بے نیاز دانش دنیش جواں ہوا تو گھر میں گھی کے چراغ جلائے گئے اور مسلسل چھ ماہ تک جشن منائے گئے لیکن چونکہ بچپن ہی سے اِس فقیر کا ہاتھ بہت صاف تھا اور شہرہ چابک دستی کا نانا سے قاف تھا

اِس لئے عادت سے مجبور ہو کر میں نے چراغوں کا گھی چرا لیا اور رشتہ کائے جشن کی نگاہ بچا کر کھا گیا تس پہ ایک مرد سر زنہ گرم چشیدہ و گرگ باراں دیدہ نے پشت پہ میری شفقت کا ہاتھ پھیرا۔ جس کے بعد مجھے بے شمار بلاؤں نے آگھیرا یعنی عالم جنوں مجھ پہ طاری ہوا، اور میں مائل بہ گناہگاری ہوا، میرے کانوں میں حاتم طائی کی طرح کوہ ندا سے ایک آواز آنے لگی اور مجھے اپنے قریب بلانے لگی، میں اِس پہاڑ پر پہونچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ چو طرف ایک لوٹ مچی ہوئی ہے، اور چند افراد کے ہاتھوں بھنڈی رچی ہوئی ہے۔ اِس پہاڑ پر میں نے زندگی کا بڑا حصہ گذرا، اور وہاں کا قیمتی سامان اپنی بغل میں مارا، اِس زمانے میں کہ میرے کھیل کھیلنے کا زمانہ تھا۔ اور ہر شخص میرے تیر فریب کا نشانہ تھا، میں نے تان سین کے ایک چیلے سے فن موسیقی حاصل کیا جس کے ذریعہ سے سننے والوں کو بے مزہ اور بددل کیا جب میں تان لیتا تو چھوٹے بچے سہم کر رونے لگتے اور جو لوگ علم و فضل میں یکتا تھے وہ سونے لگتے!

اے دوستو اور اے بزرگو جب میں اس پہاڑ کے نیچے اترا تو دنیا میری مٹھی میں تھی اور میں اُسے زور زور سے دبا رہا تھا، راستے میں میری نظر ایک مجمع پر پڑی جو ایک گول سی چیز کو لکڑی کے تختے سے مار رہا تھا، اور اس طرح اپنی عمر گنوا رہا تھا، چند لوگوں نے مجھ سے کہا کہ یہ مجمع کرکٹ کا کھیل رہا ہے میں یہ سُن کر دریائے حیرت میں غوطہ زن ہوا، اور ایک شخص سے یوں گرم سخن ہوا کہ اے بھائی مجھے بھی اس کھیل میں شامل ہونے کی اجازت چاہئے اس جوان نے کہ سینے میں اس کے کبوتر کا دل تھا، مجھے دونوں ہاتھوں سے دھکا دے کر مجمع میں ڈھکیل دیا اور وہاں پہونچکر میں نے وہ ہاتھ دکھلائے کہ بے شمار کھلاڑیوں کے چھکے چھڑائے جو گیند بھی میری طرف آتی میں اسے دوڑ کر پکڑ لیتا اور اپنی جیب میں جہاں مالِ مسروقہ تھا چھپا دیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صبح سے شام تک میری عبا تین سو گولوں سے بھر گئی اور کھیلنے والوں کی نانی مر گئی!

اے عزیزو جب نوبت یہاں تک پہونچی اور کھلاڑیوں کی فریاد زمین سے آسمان تک پہونچی تو ان لوگوں نے کہ ہر ایک ان میں کا رستمِ زماں اور دارا سکندر دوراں تھا،

مجھ پر حملہ کر دیا' جتنا مار سکتے تھے اتنا مارا یہاں تک کہ میں میدان سے سید ھا دوا خانہ سدھارا' اس وقت سے لیکر آج تک مریضوں کی طرح ایک بستر پر دراز ہوں اور نرسوں سے محو ناز و نیاز ہوں۔

۳۰ر ڈسمبر ۱۹۵۹ء

○

کھیل فٹ بال میچ درویشوں کا اور رہنا برابر میچ کا
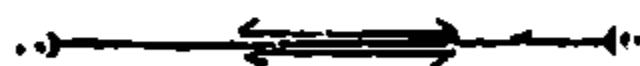
جب بادشاہ آزاد بخت بھیس بدل کر اپنے محل سرائے شاہی سے برآمد ہوا تو خدام آداب بجالائے اور بادشاہ اپنے شہر کا آنکھوں دیکھا حال معلوم کرنے کے لئے باہر نکل گیا' گشاں گشاں وہ ایسے مقام پر پہونچا جہاں تیس درویش ایک جگہ جمع تھے آزاد بخت کو خیال گذرا کہ شاید کوئی انڈو پاک کانفرنس منعقد ہو رہی ہے پھر پرچہ نویسوں نے اس کی غلط فہمی دور کی تو پتہ چلا کہ ہندستان اور پاکستان کی ٹیموں کا فٹ بال میچ ہو رہا ہے آزاد بخت بچپن میں گیند بلا خوشی سے کھیلتا تھا۔ اور ایک کھلاڑی کو بند سرے پر ڈھکیلتا تھا' یہ خبر سن کر بہت للچایا اور پہرے کے لوگوں کی نظر بچا کر اسٹیڈیم میں در آیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ خلقت کا ہجوم ہے اور مردوں کے ساتھ عورتوں کی بھی دھوم ہے کچھ کھلاڑی جن کے لباس سبز ہیں۔ میدان میں ایک جانب گولہ اچھال رہے ہیں' اور یوں اپنے دل کا حوصلہ نکال رہے ہیں دوسری جانب کچھ دوسرے کھلاڑی سفید پوشاک میں ملبوس سبزے کو کچل رہے ہیں' اور گر گر کر سنبھل رہے ہیں' اتنے میں آزاد بخت کو ریلوے گارڈ کی سیٹی سنائی دی بعد میں پتہ چلا کہ یہ کھیل شروع ہونے کا اعلان ہے' جس کو سن کر ساری پبلک حیران و پریشان ہو گئی۔ سیٹی کے بجتے ہی دونوں ٹیموں کے کھلاڑی گیند کی طرف لپکے اندھا دھند ہنگامہ برپا ہوا کہ سفید و سبز لباسوں کا تمیز کرنا مشکل ہو گیا آزاد بخت اپنی عینک کے شیشوں کو صاف کر کے بڑی گہری نظر سے اس مقابلہ کو دیکھنے لگا' جب ایک ٹیم کے کھلاڑی دوسرے کے گول پر حملہ کرتے تو وہ اپنی کرسی پر

اچھل پڑتا اور جب گیند کسی گول کے قریب پہونچتی تو وہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے تماشائی کی ران پر اس زور سے ہاتھ مارتا کہ نوبت ہاتھا پائی تک پہونچ جاتی چونکہ کھیل میں پولیس کے نمائندے بھی موجود تھے اس لئے وہ بیچ بچاؤ کر دیتے ورنہ یقیناً ہنگامہ ہو جاتا۔

راویان شیریں زبان بیان کرتے ہیں کہ یہ کھیل تقریباً ایک گھنٹے تک ہوتا رہا کبھی ایک ٹیم کا پلہ بھاری نظر آتا کبھی دوسری کا پھر دونوں پلے برابر ہو جاتے۔ تس پہ پبلک زور زور سے تالیاں مارتی اور کھلاڑیوں کا نام لے لے کر پکارتی!

جب ہاف ٹائم ہوا تو آزاد بخت نے چوبدار کو پکارا لیکن نہ اسے ناکامی کہ کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہ کی یہاں تک کہ وہ خود اپنے لئے پان لایا، ایک خود کھایا اور ایک اپنے دوست کو کھلایا، اس کے بعد اس نے بیڑی سلگائی اور کھیل دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی، اسی عالم میں اس نے دیکھا کہ کھلاڑی میدان سے واپس آرہے ہیں اور تماشائی بڑے زور سے تالیاں بجا رہے ہیں پھر اس نے اناؤنسر کی آواز سنی جو نئی قسم کی زبان بول رہا تھا، اور سننے والوں کے کانوں میں عرق گلاب زبان گھول رہا تھا۔ اس وقت آزاد بخت کو معلوم ہوا کہ ہندستان اور پاکستان کا میچ برابری پر ختم ہو گیا۔ یہ سنتے ہی بادشاہ کہ تھکا ماندہ تھا ایک کرسی پر سو گیا۔

۲۷ دسمبر ۱۹۵۹ء

سیاسی

O

میرانا کے پرچا سوشلسٹ لیڈر مسٹر پوتم تھانو پلے نے کہا ہے کہ کمیونسٹ وزیر داخلہ
مسٹر اچھوتا مینن کا یہ بیان کہ عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ
ریاست میں غنڈے باہر نکل پڑیں گے اور بہت جلد غنڈہ گردی شروع ہونے والی ہے
اس میں شک نہیں کہ مسٹر پوتم تھانو پلے نے بڑی دور کی کوڑی لانے کی کوشش کی
ہے مگر عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کی بات پر انہوں نے جس پیشنگویانہ انداز میں قیاس آرائی
فرمائی ہے اس سے ہمیں ایک بدھو شہزادے کی کہانی یاد آجاتی ہے جس کو علم نجوم کی کافی
تعلیم دے کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور جب بادشاہ نے شہزادے کے علم کا
اندازہ لگانے کی خاطر اپنی مٹھی میں ایک انگوٹھی چھپا لی اور شہزادے سے کہا کہ اپنے علم کے
زور سے اس پوشیدہ چیز کا پتہ چلا دے تو شہزادے نے فوراً زائچہ ڈالا، دیکھا، قرعہ پھینکا
اور حساب لگایا تو پتہ چلا کہ ایک ایسی گول شے ہے جس کے بیچ میں سوراخ ہے۔ اب شہزادے
نے ذہن پر زور دینا شروع کیا کہ بھلا بادشاہ کی مٹھی میں ایسی کونسی شے ہو سکتی ہے جو گول بھی ہو
اور جس میں سوراخ بھی ہو تو بڑی دیر بعد آپ کے ذہن رسا نے اپنا کمال دکھایا اور شہزادے
نے ارشاد فرمایا کہ آپ کی مٹھی میں چکی کا پاٹ ہے۔ تو پوتم تھانو پلے صاحب نے بھی صبر کا
پیمانہ لبریز ہونے کی بات کا بالکل اسی انداز میں مطلب نکالا ہے۔

۲ جنوری ۱۹۵۷ء

بچوں کے نام رکھنے کا مسئلہ خانگی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اکثر والدین سوچتے ہیں کہ ان کی اولاد کا نام نیک ہو، مبارک ہو، مفہوم کے لحاظ سے بھی شگفتہ خوبیاں رکھتا ہو۔ چنانچہ ہمیں یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ پشاور کے ایک اولوالعزم شخص نے اپنے بچہ کا نام انقلاب خاں رکھ دیا، اس لیئے کہ یہ پاکستان میں فوجی حکومت شروع ہوتے ہی عالم وجود میں آیا تھا۔ یہاں تک تو خیر کوئی حرج نہیں کہ پشاور میں گلاب خاں، جتاب خاں وغیرہ اکثر لوگوں کے نام ہوتے ہیں۔ لیکن یہ خبر پڑھ کر ہم بالکل ہی حیرت زدہ رہ گئے کہ پاکستان ہی میں ایک شخص نے اپنے نومولود کے لیئے "نوید پاکستان" کا جدید و لذیذ نام تجویز کیا ہے۔

پاکستان بننے کے بارہ برس بعد ایک طفلِ شیرخوار کی شکل میں نوید پاکستان کی تشریف آوری نہایت ہی تعجب انگیز قسم کی بات ہے، اور اس نوبت پر پہنچ کر یہ سمجھنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ جن صاحب نے اپنے لختِ جگر کے لیئے نوید پاکستان کا نام پسند کیا ہے وہ یا تو لفظ نوید کے معنوں سے بالکل بے خبر ہیں یا پھر انھوں نے اپنے بچے کا نام صرف نوید تجویز کیا ہے، اور آخر میں خواہ مخواہ پاکستان چپکا دیا ہے!

بہرحال اس قسم کے نام ہمارے وطن دوستوں کے لیئے ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں، آئندہ سے ہمارے یہاں بھی ایسے ناموں کا رواج ہونا چاہیئے۔ مثلاً انقلاب خاں کی تقلید میں ہمارے یہاں آزادی بیگ یا سواتنترا پرشاد جیسے نام رکھے جا سکتے ہیں، اور نوید پاکستان کے جواب میں "مژدہ ہند" اور "نریش سندیش" قسم کے نام تراشے جا سکتے ہیں۔

۷/ جولائی ۱۹۵۹ء

○

مرکزی وزیر اغذیہ شری ایس کے پاٹل نے ایک مرتبہ پھر اپیل کی ہے کہ عوام شکر کا استعمال ترک کردیں، اور دلیل اور تمثیل کے طور پر یہ واقعہ یاد دلایا ہے کہ جنگ کے زمانے میں برطانیہ کے عوام شکر کا استعمال نہیں کرتے تھے!

ہم اس دلیل کے سامنے سر جھکاتے ہیں، اور تمثیل پر تالیاں بجاتے ہیں کہ جو کام جنگ کے زمانے میں برطانوی عوام کر سکتے ہیں، وہ امن کے زمانے میں ہندستانی باشندے کیوں نہیں کر سکتے؟! اور اسی کے ساتھ ہی ہم یہ حقیقت اپنے عوام کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں کہ جنگ کے زمانے میں برطانیہ کے بے شمار عوام اس دنیا کو چھوڑ کر اُس دنیا میں چلے گئے تھے۔ لہذا........!

۶ر جولائی ۱۹۵۹ء

○

کمیونسٹ لیڈر مسٹر اے گوپالن نے کہا ہے کہ مسز گیدڈگی مسٹر ڈھیبر اور مسٹر راج گوپال چاری نے کیرالا کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے پیش نظر توقع کی جانی چاہیے کہ کمیونسٹ وزارت کے خلاف غیر دستوری اقدام کرکے کانگریس "ہراکری" نہیں کرے گی۔

اب تک ہندستان کے لوگ کنوئیں میں چھلانگ لگا کر زہر کھا کر یا گلے میں رسّی کا پھندا ڈال کر خود کشی کرتے رہے ہیں۔ ان بیچاروں کو ہراکری جیسے جاپانی طریقہ کی خودکشی کا کوئی علم ہی نہیں تھا لیکن جب مسٹر گوپالن جیسے لیڈر نے اس کا تذکرہ کیا ہے تو ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں اب دھان کے جاپانی طریقہ کاشت کی طرح ہندستانیوں کو خودکشی کے لئے بھی جاپانی طریقہ کو اپنانے کی طرف توجہ دینی چاہیئے تاکہ اس طرح زیادہ سے زیادہ وارداتیں ہو سکیں۔

۸ر جولائی ۱۹۵۹ء

O

الجیریا کی ایک خبر کے مطابق فرانس نواز رجعت پسند انجمن نے قوم پرستوں کو دھمکی دی ہے کہ کسی ہڑتال کی صورت میں اس انجمن کے کارکن رضاکارانہ طور پر سارا کاروبار سنبھال لیں گے اور ہڑتال کو ناکام بنا دیں گے ۔

قوم پرستوں کے خلاف رجعت پسندوں کی اس دھمکی نے ہمیں ٹوکیو کا ایک پرانا واقعہ یاد دلایا۔ کہا جاتا ہے کہ ایسی ہی کسی رجعت پسند جماعت کا ایک سرگرم کارکن وقت گذاری کے لیے کسی گیشا (جاپانی طوائف) کے گھر پہونچا اور باتوں ہی باتوں میں سرگرم کارکن نے بتایا کہ وہ شاید آئندہ ایک ہفتہ تک دوبارہ اس کے کوٹھے پر نہ آسکے۔ گیشا نے وہاں کی وجہ دریافت کی تو سرگرم کارکن نے بتایا کہ ایک تجارتی ادارے کے کارندے ہڑتال کر رہے ہیں جس کو ناکام بنانے کے لیے اس کی انجمن نے اپنے کارکنوں کے ذریعہ رضاکارانہ طور پر کاروبار کو جاری رکھوانے کا فیصلہ کیا ہے ۔ اس لئے وہ بے حد مصروف رہے گا اتنا سنتے ہی گیشا دم بخود ہو گئی اور پھر نہایت سہمے ہوئے انداز میں سوال کرنے لگی کہ ہماری انجمن بھی رجسٹری فیس میں زیادتی کے خلاف ہڑتال کرنے والی ہے تو کیا ایسے موقع پر بھی آپ کی انجمن کے کارکنان ہمارا کام .... کہتے ہیں ابھی جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے .... تو آج ہمیں الجیریا کے رجعت پسندوں کی بھی ایسی ہی ذہنیت نظر آتی ہے ۔

ڈربن کی ایک خبر کے مطابق جنوبی آفریقہ کا ایک کسان تین مختلف درختوں کی پیوندکاری سے ایک ایسا پھل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جس کی شکل و شباہت سنگترے جیسی اور خوشبو انگور جیسی اور بیشتر لکیں نارنگی جیسی ہیں اور ذائقہ ان تینوں پھلوں کا مرکب

ذائقہ ہے۔

جنوبی افریقہ کے کسان نے اپنی سرگرمی صرف پھلوں تک محدود رکھی ہے، لیکن ہندستان ایک آزاد سیاسی ملک ہے، اس لئے ہمارے سیاستدانوں نے بھی سیاسی جماعتوں کی پیوندکاری میں ایسے ایسے کمال دکھانے شروع کئے ہیں کہ جنوبی افریقہ کے کسان صرف بغلیں جھانکتے رہ جائیں گے چنانچہ کیرالا میں اپوزیشن نے ایسی ہی پیوندکاری کے ذریعہ ایک ایسا پھل حاصل کیا ہے جس کی شباہت اپوزیشن جیسی، بو فرقہ پرستی جیسی، بھانکیں مفاد پرستی جیسی اور ذائقہ ان تینوں سے بالکل مختلف کڑوا کسیلا ہے، ان سب پر طرہ یہ کہ اس کی تاثیر ٹھیٹ جمہوریت کش ہے۔ خیر یہ پھل تو مختلف درختوں کی پیوندکاری سے حاصل کیا گیا ہے لیکن راجہ جی نے تو کمال ہی کر دیا کہ درختوں اور پودوں کی مدد کے بغیر ہی چند تنکوں، پت جھڑ کی جھڑی ہوئی پتیوں اور سڑے گلے پھلوں کی پیوندکاری سے "سوتنترا" نامی ایک پھل حاصل کیا ہے۔ چنانچہ آج کل بمبئی میں اس کی نمائش بھی ہو رہی ہے۔ اس پھل کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس کی کوئی شکل نہ صورت نہیں ہے، صرف یہی نہیں بلکہ کوئی خاص ذائقہ ہے نہ کوئی خاص تاثر بلکہ ہمارے زمیندار اور سرمایہ دار شرفا اس کو جس غرض اور جس مزے کی خاطر استعمال کرنا چاہیں گے یہ وہی مزہ اور وہی تاثر دے گا۔ کہیئے اس سے زیادہ اور کوئی کمال ہو سکتا ہے۔

۹ جولائی ۱۹۵۹ء

O

تریویندرم کی ایک اطلاع ہے کہ اپوزیشن پارٹیوں کی جانب سے حکومت کے خلاف ایک بڑا مظاہرہ ہونے پر دوسرے دن کمیونسٹ حکومت کی حمایت میں زبردست مظاہرہ کیا گیا اور نمبودری پد کی حکومت قائم رہے گی کے نعرے لگائے گئے۔

مظاہروں کے تعلق سے اپوزیشن کے جنون کو ختم کرنے کے لئے دوسری کارروائیوں کے بعد جب جوابی مظاہروں کا نسخہ اختیار کیا گیا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علاج بالضد کے

بعد اب علاج بالمثل کے بھی آزمانے کا ارادہ کرلیا گیاہے' ہمارے خیال میں یہ علاج واقعی کارگر ثابت ہوگا جس طرح کہ کسی زمانے میں شنکھ دیپ کے راجہ کو بھی ایسا ہی علاج اختیار کرنا پڑا تھا۔ کہتے ہیں کہ راجہ کے وزیر با تدبیر نے ایک بار ستاروں کی گردش کا خوب حساب جوڑ کر بتایا تھا کہ فلاں تاریخ کو فلاں دن ایسی دھواں دھار بارش ہونے والی ہے کہ جو کوئی اس کا پانی پیے گا وہ پاگل ہوجائے گا یہ سن کر راجہ نے بنظر احتیاط گھڑوں پانی پہلے ہی سے اپنے ہاں جمع کر لیا' اور جب بارش ہوئی تو ساری رعایا نے بارش کا پانی پیا اور پاگل ہوگئی' اور راجہ اور ان کے منتری جی اپنے ذخیروں کا پانی پی کر بھلے چنگے رہے۔ لیکن اسی دن سے راجہ اور وزیر کے خلاف سارے راج میں مظاہرے شروع ہوگئے کہ انھیں تخت سے اتار دیا جائے۔ جلسے ہونے لگے تقریریں ہونے لگیں حتیٰ کہ ایک بار پاگل عوام کے غول نے راجہ کے محل پر حملہ بھی کردیا تھا۔ اب راجہ بے حد سٹ پٹایا۔ لیکن وزیر با تدبیر نے دست بستہ عرض کیا کہ جان کی اماں پاؤں تو ایک بات بتاؤں راجہ نے کہا کہ ضرور بتاؤ اس پر وزیر نے وضاحت کی کہ اب اپنی جان اور گدی بچانے کی ایک ہی تدبیر رہ گئی ہے کہ ہم بھی ایک ایک گلاس اس بارش کا پانی نوش جان کرلیں راجہ اور وزیر نے ایسا ہی کیا' پھر کیا تھا۔ اسی شام عوام نے چراغاں کئے۔ آتش بازی چھوڑی ناچ رنگ کی محفلیں سجائیں۔ مٹھائیاں بانٹی گئیں غریبوں کو کھانا کھلایا گیا اور لہک لہک کر تقریریں کی گئیں کہ رعایا کی خوش نصیبی سے راجہ اور وزیر دونوں صحت یاب ہوچکے ہیں' اور پاگل پن کے سارے آثار ختم ہوگئے ہیں تو آج بھی ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ کمیونسٹوں کے حمایتوں کو کو علاج بالمثل کی کرامت پر کچھ یقین آگیا ہے۔

۱۹ر جولائی ۱۹۵۹ء

O

پیرس کی ایک اطلاع کے مطابق حکومت فرانس نے اپنی سرزمین پر امریکہ کو نیوکلیر ہتھیاروں کے اڈے قایم کرنے کی اجازت دینے سے اس لئے انکار کردیا کہ اس نوعیت کے ہتھیاروں پر فرانس کا

کوئی اختیار نہیں ہے، چنانچہ اب تیزی کے ساتھ فرانس سے جوہری بم بمنہ ارامریکی لڑاکا طیارے امریکہ کو واپس ہو رہے ہیں۔

ہمارے خیال میں دل بدست دیگرے دادن وحیران بودن کی اس صورتحال کے خلاف حکومت فرانس کا اقدام یقیناً بے حد دانشمندانہ ہے، اور ہمیں اس واقعہ کی یاد دلاتا ہے جب کہ ابتدائی مغل بادشاہوں کے دور میں شاہ ایران کو ہندستان آنے کی دعوت دی گئی تھی اور وہ جب ہندستان کے دورے پر تشریف لائے تو شاہانہ مراتب کا لحاظ کرتے ہوئے ایک نہایت ہی سجائے سجائے ہاتھی کی سواری پیش کی گئی، شاہ ایران اس سجاوٹ کے کروفر اور اس کی شان وشوکت سے بے حد متاثر ہوئے اور نہایت خوشی کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو گئے لیکن ہاتھی پر ہودہ میں رونق افروز ہونے کے بعد انہوں نے جب یہ مطالبہ کیا کہ اس جانور کی لگام ان کے ہاتھ میں دی جائے تو وضاحت کی گئی کہ یہ سواری لگام سے بے نیاز ہوتی ہے، اور گردن پر بیٹھا ہوا مہاوت ایک انکش کے ذریعہ اسے اپنے قابو میں رکھتا ہے اتنا سنتے ہی وہ ہودہ سے اتر گئے اور کہنے لگے کہ کوئی بھی شہسوار ہرگز ایسی سواری پر نہیں بیٹھ سکتا جس کی لگام خود اس کے اپنے ہاتھ میں نہ ہو اور مغل شہنشاہوں کو بھی شاہ ایران کا یہ دوراندیشانہ فلسفہ اس وقت اچھی طرح سمجھ میں آنے لگا جب کہ جنگ کے میدانوں میں گھمسان کا رن پڑنے پر ہاتھیوں کی صفیں پلٹ پلٹ کر خود اپنی فوجوں کو روندتی ہوئی فرار ہونے لگیں اور اب آج پھر ایک بار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جنرل ڈی گال نے اس تاریخی واقعہ سے سبق لیا ہے۔ اور ایسے نیوکلیر ہتھیاروں کے اڈے قایم کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ جن کی لگام فرانس کے بجائے امریکہ کے ہاتھ میں ہو۔

سوتنترا پارٹی کے مسٹر مینو مسانی نے اس پارٹی سے متعلق مسٹر نہرو کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ موجودہ معاشی زندگی میں غیر یقینی کیفیت پیدا ہو گئی ہے جس کو

دور کرنے کے لئے پہلی مرتبہ ایک سیاسی جماعت سامنے آئی ہے ۔

اچھا ہوا کہ مینو مسانی صاحب نے نہایت بروقت یہ انکشاف فرما دیا کہ معاشی زندگی کی غیر یقینی کیفیت کو دور کرنے کے لئے پہلی مرتبہ ایک سیاسی جماعت سامنے آئی ہے ورنہ ہم اب تک اسی خیال میں تھے اور اسی پیمانے پر سیاسی جماعتوں کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ تاش کھیلنے شطرنج کی بازیاں جمانے پتنگ بازی کے مقابلے کرنے بٹیروں کی پالیاں ڈالنے اور مرغ لڑانے کے لئے وجود میں آتی ہیں شکر ہے کہ آج پہلی بار ان کی پارٹی نے روایات سے انحراف کیا اور ایک انقلابی قدم اٹھایا ہے تو ان کے معاشی پروگرام کے تعلق سے مسانی جی کے نام کے پہلے حصے یعنی MINOO کو MENU سے بدل کر یہ دریافت کرنا پڑے گا کہ

یہ بتا چارہ گر تیرے اس مینو میں
حلوۂ دردِ افلاس و نکبت بھی ہے
اور جوشاندۂ پیاس وحدت بھی ہے

۲۰ جولائی ۱۹۵۹ء

O

کروشچوف صاحب کے بارے میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ پولینڈ میں ریکاٹ کے مقام پر وہ ایک ایسے سرکاری فارم کا معائنہ کرنے کے لئے گئے تھے جہاں گھوڑے رکھے جاتے ہیں اور جب لوگوں نے نہایت شاندار طریقہ پر ان کا استقبال کیا اور نعرے لگانے لگے تو ایک گھوڑا بدک گیا اور سرپٹ بھاگنے لگا جس کو بڑی مشکل سے قابو میں لایا جا سکا ۔

اب تک ہم یہی سنتے آئے تھے کہ سرخ رنگ کے کپڑے کو دیکھ کر سانڈ بدک جاتے ہیں اور سینہ تاننے نہیں بلکہ سینگیں تان کر حملہ آور ہو جاتے ہیں چنانچہ اس بنا پر اسپین میں سانڈ لڑائی (BULL FIGHT) کا کھیل بھی کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے ۔ لیکن اب اس خبر سے پتہ چلتا ہے کہ مسٹر کروشچوف اتنے زیادہ سرخ ثابت ہوئے کہ گھوڑے بھی بدک کر بھاگنے لگے ۔

پونا کے ایک ہفتہ وار اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے آچاریہ ونوبا بھاوے نے بتایا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں وہ اکثر اسکول سے بھاگ جایا کرتے تھے اور یہ کہ بڑا آدمی بننے کے لئے مدرسہ سے غیر حاضر رہنا ضروری ہے۔ آچاریہ جی کی بات پر ہمیں پورا پورا وشواس آگیا۔ کیونکہ ایسی ہی ایک فلسفیانہ بات سوچ کر ہم نے بھی طالب علمی کے زمانے میں اسکول کو ڈبکے مارنے شروع کئے تھے۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں آج ہم بہت بڑے آدمی ...... یعنی بہت بڑے نکمّے آدمی بنے ہوئے ہیں ......

۲۱ جولائی ۱۹۵۹ء

○

شری این۔ وی گیڈگل نے جو پنجاب کے گورنر ہیں، حال ہی میں ایک جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "حصول آزادی کے بعد ملک میں کردار کا بحران پیدا ہو گیا ہے"!

بلاشبہ اس بحران کو ہماری نظریں بھی دیکھ رہی ہیں۔ لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ غرض کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حصول آزادی کے بعد ملک میں صرف کردار کا بحران پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ اور بھی کئی بحران نمودار ہو گئے ہیں جنھوں نے زندگی کو مضحکہ خیز اور عبرت انگیز بنا کر رکھ دیا ہے۔

مثلاً ہمارے یہاں کردار کے ساتھ "گفتار" کا بحران بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی مختلف کوششوں اور مختلف پلیٹ فارموں سے اتنی باتیں کی جاتی ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور اگر سنائی دیتی ہے تو سمجھ میں نہیں آتی ہے، جس لیڈر کی طرف نظر اٹھائیے اسے کچھ نہ کچھ بولتا ہوا پائیے گا۔ ایک ہی بات بار بار کہی جاتی ہے یا پھر بے شمار باتیں ایک ساتھ کہہ دی جاتی ہیں۔ نتیجہ کے طور پر یہ تمیز مشکل ہے کہ باتوں کا وزن زیادہ ہے یا مقدار!

گفتار کے بحران کا مطالعہ کرنے سے فرصت ملے تو ایک نظر "اطوار" کے بحران پر بھی ڈال لیجئے۔ یعنی لوگوں میں رشوت خوری، جانبداری، پارٹی بندی، اقربا نوازی، ضمیر فروشی،

بددیانتی یہاں تک کہ "لیپا ڈگی" کی عادتیں اس درجہ راسخ ہو چکی ہیں کہ اب "عادت" کو "شخصیت" سے جدا کرنا مشکل ہے۔

کردار، گفتار، اور اطوار کے ساتھ ایک بحران "افکار" کا بھی ہے، جس میں ہمارے لیڈروں سے لیکر شاعر حضرات تک مبتلا ہیں، لیڈر اپنے افکار کے ذریعہ عوام کو اندھیرے میں رکھتے ہیں اور شاعر اپنے افکار تازہ کو بغرض اشاعت اخبارات کے دفتروں میں روانہ کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا کوئی پنج سالہ منصوبہ کامیاب ہو نہیں پاتا!

۴ راکتوبر ۱۹۵۹ء

○

اخبارات کسی ملک کی زبان ہوتے ہیں، اور اس کے حالات کا بیان ہوتے ہیں۔ یعنی بالفاظ دیگر آپ اخبارات کے مطالعہ سے کسی ملک کے ما لہ و ما علیہ کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور اپنی جگہ ایک رائے قایم کر کے اطمینان کا سانس لے سکتے ہیں چنانچہ آج کے ایک اخبار کی چند سرخیاں ملاحظہ ہوں!

سرکاری ملازم کے ادائے فرض میں مزاحمت
ایک تاجر کے خلاف مقدمہ
تعلیم یافتہ دھوکہ باز نوجوانوں کی گرفتاری
سابق سزا یافتہ دھوکہ باز نوجوانوں کی گرفتاری
بیروزگاری سے تنگ آکر سرقوں کا ارتکاب
مسجد سے جا نماز چراتے ہوئے ایک شخص کی گرفتاری۔

یوں تو ان تمام عنوانات سے ملک کے اخلاق کا درجہ حرارت معلوم ہو سکتا ہے لیکن آخری سرخی تو ایسی ہے جسے پڑھنے کے بعد مریض کے اعصاب کی کمزوری اندرون و دماغ کی نقاہت بھی بے نقاب ہو جاتی ہے۔ لوگ سجدوں میں نماز

پڑھنے کے لئے جاتے ہیں، اور اللہ کو یاد کرنے کے لئے جاتے ہیں اور اپنے گناہ بخشوانے کے لئے جاتے ہیں، لیکن اس شخص کی "انفرادیت" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس نے جانماز چرانے کی نیت باندھ کر خانہ خدا میں قدم رکھا اور بحیثیر حکومت کا مہمان بن گیا۔

ایک زمانہ تھا مسجدیں صرف عبادت کرنے کے لئے استعمال کی جاتی تھیں، اس وقت ایسے واقعات نہیں ہوتے تھے، یعنی لوگ صرف نماز پڑھتے تھے اور واپس آجاتے تھے مگر جب سے مسجدوں میں سیاسی موضوعات پر طبع آزمائی ہونے لگی اور عبادت کی بجائے حریفوں کو گالیاں دینے کا سلسلہ شروع ہوا ہے لوگ مسجدوں سے جوتے چرانے لگے ہیں اور اب تو نوبت جانمازوں تک جا پہونچی ہے۔

۱۲ نومبر ۱۹۵۹ء

O

امریکہ کے سکریٹری آف لیبر نے دعویٰ کیا تھا کہ گذشتہ اکتوبر تک ملک میں بیروزگاروں کی تعداد (۳۰) لاکھ سے کم ہو جائے گی اور قسم کھائی تھی کہ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ اپنی ہیٹ کھا جائیں گے!

موصوف کی شومئی قسمت یا خرابی معدہ کے تحت جب مقررہ مہینہ میں اعداد و شمار جمع کئے گئے تو پتہ چلا کہ بیروزگاروں کی تعداد (۳۲) لاکھ سے بھی زیادہ ہو گئی ہے چنانچہ امریکہ کے سکریٹری آف لیبر کو اپنی قسم کے مطابق ہیٹ کھانی پڑی، یہاں یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جب آپ ہیٹ کھا رہے تھے اس وقت دوسرے لوگ آپ سے ہمدردی کر رہے تھے، بلکہ اس کے برعکس لوگوں کو رشک آرہا تھا، اس لئے کہ وہ ہیٹ کیک سے...... تیار کی گئی تھی۔

قطع نظر اس کے کہ مذکورہ ہیٹ کیک کے مانند تھی یا کپڑے یا کاغذ کی بنی ہوئی تھی، سوال یہ ہے کہ اگر عہدیداروں میں اس قسم کی قسما قسمی علی العموم رائج ہو جائے تو اس

کالم کے لئے اچھا خاصا خام مواد ہاتھ آسکتا ہے۔ مثلاً کوئی افسر صاحب اس بات پر حلف اٹھا سکتے ہیں کہ اگر میں فلاں کام نہ کر سکا تو اپنی پتلون چبا جاؤں گا کوئی دوسرا مدیر اور یہ عہد کر سکتا ہے کہ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں تو اپنا کالر نگل لونگا یا کوٹ کھا جاؤں گا' یا بوشرٹ تناول کر ڈالوں گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسی قسموں سے کچھ نہیں ہو سکتا یعنی بیروزگاری کم کرنے کے مسئلہ کا لباس چبانے سے کوئی تعلق نہیں!!!

۱۳ر نومبر ۱۹۵۹ء

○

ڈسمبر میں شری جے پرکاش نارائن صدر ایوب خاں سے ملاقات کریں گے!

اور شاید اس ملاقات میں حسب ذیل گفتگو ہو گی!

آداب عرض ہے

وعلیکم السلام

کہئے کیسے آنا ہوا؟

سرحدوں پر گفتگو کرنے کے لئے

یہ کن صاحب کا نام ہے

نام نہیں ایک تحریک ہے۔

بہت خوب

جی ہاں!

آپ کے کام کا طریقہ کیا ہے۔

پولیس اور جیل!

عدم تشدد کیوں نہیں؟

لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔

- سوشلزم کسے کہتے ہیں۔

کتابوں کا ایک کیڑا ہوتا ہے۔

چلئے پلوائیے

پپیتا بھی کھائیے اچھا ہوتا ہے۔

آپ ہندستان کے دوست ہیں؟

بے شک۔

مصافحہ کیجیے!

معانقہ فرمائیے

(۔ پس منظر میں ہلکی نشاطیہ موسیقی ۔)

(فیڈ آؤٹ)

۲۲ نومبر ۱۹۵۹ء

O

یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کراچی کے ان طلبا نے جو لومبا کے قتل کی مذمت کرنا چاہتے تھے پاکستان کے مشہور و معروف روزنامہ ڈان کی کاپیاں سرِبازار جلا ڈالیں، اس لئے کہ اس کے ایڈیٹر مولانا الطاف حسین صاحب (حالی نہیں) نے لومبا کے دشمنوں کی حمایت فرمائی تھی۔

لیکن اس سلسلہ میں جو تفصیلات حال ہی میں آئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ڈان کے ایڈیٹر صاحب یا تو شومبے اور موبوتو وغیرہ کے قریبی عزیز واقع ہوئے ہیں یا پھر ذہنی حیثیت سے آپ کا رشتہ کسا ؤبو اور کالونجی وغیرہ سے ملتا ہے اور کیا عجب ہے کہ تحقیق کے بعد موصوف کا وطن مالوف بلجیم ثابت ہوا!

اخبار نویسی بھی ایک قسم کی دوکان ہے جسے چمکانے کے لئے طرح طرح کے

پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، اور جب کسی دوکاندار کو پاپڑ نہیں ملتے تو وہ سیدھے سادے سائل
بیلنا شروع کر دیتا ہے یہی حال ایڈیٹر صاحب ڈان کا معلوم ہوتا ہے، چنانچہ جب انہوں
نے دیکھا کہ ساری دنیا کے انصاف پسند عوام جس میں ہندستان کے مفکر اور پاکستان کے
مدبر تک شامل ہیں لوممبا کے قتل کی مذمت کر رہے ہیں اور کانگو میں سامراجی طاقتوں کی
ریشہ دوانیوں کو برا بھلا کہہ رہے ہیں تو انہوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی اور
اس کی چھت پر کھڑے ہو کر یوں آواز بلند کی کہ لوممبا کو خود اس کے ساتھیوں نے قتل کیا ہے
اور اس سلسلہ میں یہ بھی فرما ڈالا کہ بلجیم نے کانگو کو قبل از وقت آزادی دے دی تھی!
لوممبا کو کس نے قتل کیا یہ کوئی ایسا سوال نہیں جس کے دو جواب ممکن ہوں ظاہر ہے کہ لوممبا
جن غلبہ پرست قوتوں کے درمیان حارج تھے وہی ان کے قتل کے ذمہ دار ہیں۔

لیکن ایڈیٹر صاحب "ڈان" کو نہ جانے علم ہیئت آتا ہے یا انہوں نے کوئی ہمزاد قبضہ
میں رکھا ہے جس کی دی ہوئی اطلاع کے بنا پر وہ اتنا زبردست سفید جھوٹ بول رہے ہیں
جو کوئی سیاہ قلب انسان ہی بول سکتا ہے!

افسوس ہے کہ جب بلجیم نے کانگو کو نام نہاد طور پر آزاد کیا تھا اس وقت وہاں
کی حکومت نے یہ نہیں سوچا کہ کراچی میں مولانا الطاف حسین صاحب ایڈیٹر "ڈان" بھی رہتے
ہیں جو کسی کام کے لئے نیک ساعت بتاتے ہیں ورنہ وہ ضرور موصوف سے مشورہ کرتی اور
کانگو کو قبل از وقت آزادی نہ دیتی اگر ایسا ہوتا تو یقیناً اس وقت کانگو میں امن و سکون
کی حکمرانی ہوتی اور الطاف حسین صاحب ایڈیٹر "ڈان" مزے سے وہاں بیٹھے ہوئے افریقہ
کا پلاؤ کھاتے رہتے!

بہرحال دنیا میں جدت پسندوں کی کمی نہیں، اور ان ہی میں ایک "ڈان" کے ایڈیٹر
ہیں جو ساری دنیا سے نرالی بات کہہ رہے ہیں انھیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ کراچی کے
انصاف پسند نوجوان ان کے اخبار کی کاپیاں شارع عام پر جلا رہے ہیں ان کی مثال

اس شخص کی پہچان کرنے کے بعد بھی اس بات پر فخر کر رہا تھا کہ اس کی ٹانگ تو اونچی رہی !

پہلے تو بے چارے لومبا کو مار کر پھینک دیا گیا پھر یہ افواہ اڑائی کہ اُسے گاؤں والوں نے مارا ہے اور جب کہ اس کی لاش کو طلب کیا گیا تو نہایت بے نیازی سے فرمایا گیا کہ افریقہ میں لاشوں کو نکالنے کا رواج نہیں ہے، چونکہ اس طرح مردہ بھوت بن کر لوگوں کو ستاتا رہتا ہے!

تحلیل نفسی کے عمل سے کام لیجئے تو پتہ چلے گا کہ یہاں آکر چوری پکڑی گئی آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ بھوت پریت سے کون لوگ ڈرتے ہیں، اگر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ عموماً ظالم، بزدل، شکی اور وہمی ہوتے ہیں، جن کی آبادی افریقہ سے لے کر ہندستان تک پھیلی ہوئی ہے، اور عام انسانوں کے لئے درد سر بنی ہوئی ہے !

ایسے واقعات آپ نے سنے ہوں گے کہ کسی شخص نے کسی دوسرے شخص کو قتل کر ڈالا، اور اس کی لاش چھپا دی لیکن اس کے بعد اس پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا اور وہ اپنے سایہ سے بھی ڈرنے لگا اور اسے ہر طرف مقتول کی پرچھائیاں پھرتی ہوئی نظر آنے لگیں، یہاں تک کہ ایک دن وہ سڑک پر کھڑے ہوئے کسی سپاہی کو بھوت سمجھ کر بے ہوش ہوگیا: وہ بیچارا اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملا !

کچھ یہی حالت لومبا کے قاتلوں کی ہے انھیں تھوڑے دن بعد ہر طرف لومبا کا بھوت نظر آنے لگے گا۔ یعنی وہ موبوتو، شومبے کو بھوت سمجھیں گے

کساوبو اور کالونجی پر بھوت پریت ہونے کا شبہ ہوگا پھر ان سب کو بہ یک وقت غش آجائے گا اور یہ اپنے کیفر کردار کو پہونچیں گے !

۲۴ فروری ۱۹۶۱ء

O

پہلے تو ضروری اشیاء پر محصول عاید کرکے ان کی قیمتیں بڑھادی گئیں اور اب یہ کہہ کر

تسلی دی جا رہی ہے کہ ان قیمتوں کو عام آدمی کی معاشی سطح سے بڑھنے نہیں دیا جائے گا !

مار دو بھی جلاؤ بھی آسان ہے سب تم کو
آنکھوں میں ہلاہل ہے ہونٹوں پہ مسیحائی

لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے ملک میں عام آدمی کی معاشی سطح کیا ہے ؟ گہری نظر سے دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ دراصل کوئی سطح سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ عام آدمی پر جو مصیبت پڑتی ہے وہ صبر و شکر کے ساتھ جھیلتا ہے اور اسی کو اپنی اخلاقی سطح سمجھتا ہے۔

اور جہاں تک ہمارا ناچیز خیال ہے یہ ممکن ہی نہیں کہ چیزوں پر بے تحاشا محصول لگایا جائے اور ان کی قیمتوں میں اضافہ نہ ہونے دیا جائے' چنانچہ آپ گھر سے باہر نکل کر دیکھ سکتے ہیں کہ جب سے نیا بجٹ آیا ہے۔ چیزوں کی قیمتیں اس درجہ بڑھ گئی ہیں کہ ناطقہ سر بگریباں ہے آپ چار نئے پیسے جیب میں ڈال کر پان کی دوکان پر جائیے اور ایک بیڑہ کسی دبا کر سرخرو ہونے کی کوشش فرمائیے' پتہ چلے گا کہ پان کی قیمت تو ۵ نئے پیسے ہو گئی ہے اور آپ کے چار پیسوں کا مصرف فقط یہ ہو سکتا ہے کہ آپ انھیں کسی فقیر کو دے ڈالیں' سے

ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہو گا ؎ اور درویش کی صدا کیا ہے

سگریٹ کا عالم بھی یہی ہے' اور تحقیق و تفتیش کے بعد انکشاف کیا گیا ہے کہ اب کوئی سگریٹ ایسا نہیں رہا جو ایک نئے پیسے میں مل سکے' اس لئے جہاں تک سگریٹ کا سوال ہے ایک نیا پیسہ بالکل بیکار ہے لہٰذا آپ اسے بھی کسی گداگر کی جھولی میں ڈال دیجئے'۔

پہلے لوگ ایک ماچس سے تین سگریٹ جلاتے ہوئے ڈرتے تھے اور اسے بدشگونی سمجھتے تھے' لیکن جب سے ماچس گراں ہوئی ہے۔ ایک شخص دیا سلائی روشن کر کے سڑک کے کنارے کھڑا ہو جاتا ہے تاکہ دوسرے کا سگریٹ سلگا سکے۔ اور ایک سلائی کو زیادہ سے زیادہ کام میں لا سکے !

بے شمار مثالیں ہیں، لیکن ہم فی الحال اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اگر نئی محصول اندازی کے باوجود چیزوں کی قیمتیں معاشی سطح سے نہ بڑھیں تو ہم اسے ایک چمتکار سمجھیں گے!

۱۵ مارچ سنہ ۱۹۶۱ء

○

مردم شماری کا زمانہ ایک آندھی کی طرح آیا اور گزر گیا لیکن اس کی مابعد الطبیعیات کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور اس سلسلے میں روزانہ کوئی نہ کوئی لطیفہ اخبارات کے صفحات پر وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً تازہ ترین خبر یہ ہے کہ میسور میں کچھ بدنصیب مردم ایسے بھی تھے جو شمار سے محروم رہ گئے تھے، ان کی خطا محض اتنی تھی کہ یہ آگ توت لایموت حاصل کرنے کی خاطر لکڑیاں کاٹنے کے لیے جنگل کی طرف گئے ہوئے تھے، اس دوران میں کارکنان مردم شماری ان کی جھونپڑیوں کو ملاحظہ کرتے ہوئے چلے گئے۔ مردم شماری کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے کسی ملک کے باشندوں کی تعداد معلوم ہوتی ہے، اور بعض دوسری تفصیلات کا پتہ چلتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو لوگ شمار میں نہ آئیں ان کا عدم و وجود برابر ہو کر رہ جاتا ہے یعنی اگر اب میسور کے مذکورہ لکڑہارے باواز بلند چلائیں کہ اے مردم شماری کرنے والو ـــ

تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

لیکن ان کی فریاد کوئی نہ سنے گا، جب ان کا اندراج تختۂ مردم شماری میں نہیں ہے تو گویا یہ ہندستان میں نہیں ہیں!

اور جب میسور میں یہ واقعہ ہو سکتا ہے تو دوسرے مقامات پر بھی ضرور ہو سکتا ہے اس طرح پتہ نہیں مردم شماری کے بعد کتنے ہندستانی ایسے ہیں جن کی نسبت غالب کا یہ مصرعہ بہ تصرف تصوف صادق آتا ہے کہ ـــ

ہر چند کہیں کہ ہیں، نہیں ہیں!

ہمارا کام صرف صورت حال کو پیش کر دینا تھا، اصلاح صرف حکومت کر سکتی ہے۔

۱۲ مارچ ۱۹۶۱ء

○

بی بی سی کا نامہ نگار بڑی دور کی کوڑی لایا ہے۔ اس نے اطلاع دی ہے کہ کانگو میں جو قبائلی شومبے کے حامی اور لومبا (مرحوم) کے مخالف ہیں وہ آجکل بڑی پریشانی اور دہشت کے دور سے گزر رہے ہیں، ان کا خیال ہے کہ لومبا کی روح ابھی تک فضاؤں میں موجود ہے، فصلوں کو تباہ کر رہی ہے، انسانوں کو نقصان پہنچا رہی ہے، انھوں نے اس آفت سے بچنے کے لئے (جو نہ ارضی ہے نہ سماوی ہے بلکہ معلق ہے) بڑے بڑے جادوگروں کو جمع کیا ہے، جنتر منتر کا سلسلہ جاری ہے، ٹونے ٹوٹکے سے کام لیا جا رہا ہے، اور ظاہر ہے کہ ان عظیم جادوگروں کو بڑے بڑے نذرانے دئیے جا رہے ہیں، جادو کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ سر پر چڑھ کر بولتا ہے، یہاں معاملہ برعکس ہے، یعنی کچھ لوگ جادو کے سر پر چڑھ کر بول رہے ہیں، بھلا آپ ہی غور فرمائیے کہ جب اپنی زندگی ہی میں بیچارہ لومبا شومبے کی فصل کو جو اس نے بلجیم اور ادارہ اقوام متحدہ کی مدد سے حاصل کر لی تھی، تباہ نہ کر سکا تو اس کی روح یہ کام کس طرح کر سکتی ہے، بات اتنی معلوم ہوتی ہے کہ شاید شومبے اور اس کے ساتھیوں کیلئے اب کوئی بڑا ذریعہ معاش باقی نہیں رہا ہے اس لئے ان لوگوں نے بھانامتی اور جنتر منتر کا یہ چکر چلایا ہے تاکہ اسی طرح چار پیسے ہاتھ لگیں، اور جیبیں برابر بھرتی جاتی رہیں ؎

جھولیاں سب کی بھرتی جاتی ہیں
دینے والا نظر نہیں آتا!

ان قبائل کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ لومبا کی روح تھوڑے دنوں میں بہت طاقتور ہو جائے گی یہاں تک کہ ایک دن شومبے کو ہلاک کر دے گی! اس نوبت پر عرض کیا جاتا ہے کہ بالکل یہی عقیدہ ہمارا بھی ہے۔

لاہور میں ایک اخبار نویس نے صحافت کو ترک کر دیا ہے اور زراعت شروع کر دی ہے!
گویا صاحب موصوف پہلے کاغذ پر الفاظ کی کاشت کرتے تھے اور پیٹ بھرتے تھے
اب زمین پر گیہوں کی تخم ریزی فرمائیں گے اور موج اڑائیں گے!

ایک اخباری اطلاع کے مطابق مشہور ڈاکو بھوپٹ پھر ہندستان آئے گا تاکہ سابق
مہاراجاؤں کی مدد کرے اور الکشن کے زمانے میں سوتنترا پارٹی کو کامیاب بنائے!
ایسی خبروں سے ہم اس ذہنی رشتے کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو مختلف "جماعتوں"
اور مختلف "افراد" کے درمیان پایا جاتا ہے!
ویسے اگر بھوپٹ نے سابق مہاراجاؤں اور سوتنترا پارٹی کی طرف دستِ تعاون
دراز کیا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں!

سنا ہے کہ مہاراجہ جے پور نے بھی سوتنترا پارٹی میں شرکت کا فیصلہ کر لیا ہے! اس
فیصلہ کا اعلان ایک جلسہ عام میں کیا جائے گا! پہلے مہارانی جے پور سوتنترا پارٹی میں شریک ہوئے اور
اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ خصوصی "مہمان خانہ" میں اپنا "بستر" بچھائے ہوئے ہیں! اب مہاراجہ
جے پور کی شرکت سے امید ہے کہ پارٹی کا وقار اور بڑھے گا!

۲۰ مارچ ۱۹۶۱ء

○

بمبئی میں میونسپل کارپوریشن کے انتخابات کا پروپگنڈہ جس عنوان سے ختم ہوا وہ بہت دلچسپ
اور حوصلہ افزا ہے یعنی چند زندہ دلوں نے ایک کتے کا جلوس نکالا، دوسری طرف بعض لوگوں
کو جوش آیا تو انہوں نے ایک گدھے کو سجا بنا کر جلوس کی شکل میں شارع عام پر گھما دیا، بس
پھر کیا تھا، سینکڑوں عوام الناس جمع ہو گئے اور تالیاں بجانے لگے!

ہم تو سمجھتے تھے کہ زندہ دلی صرف پنجاب پر ختم ہو گئی ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ بمبئی کے باشندوں میں بھی "شئے لطیف" کی کمی نہیں ہے' انہوں نے میونسپل کارپوریشن کے انتخابات میں کتّے اور گدھے کا جلوس نکال کر حسن اشاریت پسندی کا ثبوت دیا ہے' اس کی داد نہ دینا ظلم ہے!

پنجاب کی زندہ دلی کا ایک تازہ ثبوت اس طرح ملا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کے ایک ممتحن نے امتحان کے پرچے میں طلبا کے لئے ایک خط لکھنے کی ہدایت بھی کی تھی' اس خط کا موضوع عشقیہ تھا اور اس کے ذریعے طلبا کو یہ بتانا تھا کہ وہ اپنی محبوبہ سے شادی نہیں کر سکتے اس لئے کہ ان کے والدین ناراض ہیں!

سنا ہے اس ممتحن کو "اقتدار اعلیٰ" نے نا اہل قرار دیا ہے' ہم ہوتے تو ہرگز ایسا نہ کرتے آخر طلبا کو عشقیہ خطوط لکھنے ہی پڑتے ہیں۔ اگر اس کی تربیت استادوں کے سامنے ہی ہو جائے تو کیا حرج ہے!

۲۹ مارچ سنہ ۱۹۶۱ء

○

ایک شاعر نے فلمی گانے کے ذریعہ ہمیں یہ تو بتا دیا کہ CAT کیٹ کے معنی ہوتے ہیں بلّی لیکن یہ نہیں بتایا کہ بلّی اگر دودھ پی نہیں سکتی تو کیوں گرا دیتی ہے' یہ بلّی کی فطرت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے جس پر ہمارا کوئی اختیار نہیں!

بالکل اسی طرح گوا کے سابق حکام کی فطرت بھی اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے اور اس پر بھی ہمارا کوئی اختیار نہیں ہے' اب آپ ہی غور فرمائیے کہ جب گوا کے پرتگیزی حکام نے اپنے لئے سوائے راہ فرار کے اور کوئی راستہ نہ پایا تو بہت سی عمارتوں کو نقصان پہونچانے کی کوشش شروع کر دی' صرف یہی نہیں بلکہ جیل خانوں کے دروازے بھی کھول دیئے تاکہ تمام قیدی

جن میں چور، اُچکے، اٹھائی گیرے، غنڈے، اور بدمعاش اور قاتل شامل تھے، بھاگ جائیں اور ہندستانی نظم و نسق کے لیے درد سر بن کر رہ جائیں۔

وہ جو کہتے ہیں کہ

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

اس کا عملی مظاہرہ شاید اتنا بہتر کبھی نہ ہوا ہو۔ گوا کے سابق پرتگالی حکمران چونکہ خود مجرم تھے اس لئے جاتے وقت انھیں مجرموں سے ہمدردی ہو سکتی تھی۔

بہر حال یہ بھی اچھا ہی ہوا یعنی ایک بڑے جیل خانے کے قیدی جب رہا ہوئے تو اس کے اندر چھوٹے جیل خانے میں رہنے والوں کو بھی کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع مل گیا۔ اب ان کا معاملہ نئی حکومت کے ساتھ ہے۔ جو یقیناً سابقہ حکومت کے مقابلہ میں بہتر ہے۔

گوا کے سابق وزیر اعظم یعنی جناب سالازار جن کی نسبت کسی نے لکھا تھا کہ ؎

؎ یہ عجب شخص ہے "سالا" بھی ہے اور "زار" بھی ہے۔

آج کل برطانیہ پر بہت برہم ہیں، ان کا خیال ہے کہ گوا اور ہندستان کی کشمکش میں برطانیہ نے گوا کی اتنی حمایت نہیں کی جتنی کہ کرنی چاہیئے تھی ان کی رائے میں برطانیہ کو چاہیئے تھا کہ جب ہندستانی پولیس گوا کی طرف بڑھی تھی اس وقت وہ اپنی فوجوں کو لنگوٹ بندھوا کر مقابلہ کے لئے بھیج دیتا اور اس طرح گوا پرتگال کا حصہ بنا رہتا۔

ہٹ دھرمی کی بات اور ہے ورنہ واقعہ تو یہ ہے کہ برطانیہ نے گوا کی بہت طرفداری کی ہے اور اب اس کی حیثیت ایسے نوجوانوں کی ہو گئی ہے جو شریفوں کی صحبت میں بیٹھنے کے قابل نہ ہو!

انسانی فطرت کبھی کبھی عجیب ہو جاتی ہے چور کے لئے ہم چاہتے ہیں کہ وہ قاتل بن جائے جھوٹا آدمی دغابازی بھی کرنے لگے اور جیب کترا ڈاکہ زنی شروع کر دے!

شری کا مکلینی کی خدمت میں بعد ادب گزارش ہے کہ ہماری اردو زبان میں ایک ایسا شعر

بھی موجود ہے، جسے موصوف سالارِ زار کو مخاطب کر کے پڑھ سکتے ہیں ؎

شعر ملاحظہ ہو:

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

۲۵ دسمبر ۱۹۶۱ء

○

نام ٹھیک سے یاد نہیں رہا مگر یہ قول یا تو نپولین کا ہو سکتا ہے یا پھر مجنوں کا کہ ——— جنگ اور محبت میں سب کچھ روا ہے'— اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے الکشن کو بھی ایک قسم کی سرد جنگ سمجھ لیں۔ (اس ہنگامہ کو محبت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا) تو پھر ماننا پڑے گا کہ الکشن میں بھی سب کچھ روا ہے، چنانچہ ملاحظہ فرمائیے کہ الکشن کے نام پر آج کل ہمارے ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے یا ہو سکتا ہے وہ کسی دوسرے زمانے میں ممکن ہی نہیں تھا!

ملاحظہ ہو گوالیار میں جب ایک مہارانی صاحبہ امیدوار کی حیثیت سے کھڑی ہوئیں تو لوگوں کو خوشی ہوئی کہ اب گوشہ نشین شخصیتیں بھی میدانِ سیاست میں قدم رنجہ فرما رہی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی کسی دوسری پارٹی کی طرف سے یہ متوازی اعلان بھی منصۂ شہود پر رونق افروز ہوا کہ مہارانی موصوفہ کے مقابلے میں ایک بھنگن کو ٹکٹ دیا جائے گا' اور وہ دونوں ہاتھوں سے جھاڑو تھام کر اپنی امیدواری کے کرشمے دکھائیگی' میر تقی میر زندہ ہوتے اور انتخابات میں امیدوار بنتے تو ہم ان سے دست بستہ عرض کرتے کہ ؎

دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار!

یہ خبر تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ کڑپہ میں کسی صاحب نے رائے دہندوں کے لئے' ایک لنگر خانہ کھول رکھا ہے۔ جہاں غربا کو دو وقت کا کھانا دیا جاتا ہے' ایک دوسرے امیدوار کی نسبت خبر آئی تھی کہ وہ نئے سال کا کیلنڈر تقسیم کر کے رائے دہندوں میں اپنے لئے زمین

ہموار کر رہے ہیں، اس کے ساتھ ہی ایک مقامی جماعت سے ارکان ثلاثہ کی کارگذاری بھی پیش نظر رہے، جنھوں نے ایک جلسہ عام میں اس جماعت کے لیڈر کا پول کھول کر رکھ دیا اور اس چیک کا نمبر بھی بتا دیا جس کے ذریعہ سے ان کی جیب ہلکی کی گئی تھی، اندریں کئی امیدواروں نے تلنسگرات کے موقعہ پر مفت پتنگیں تقسیم کیں! جن پر امیدواروں کے نام درج تھے! بہرحال اس ہنگامہ زار انتخاب میں رائے دینے والے سادہ لوح حضرات پریشان ہیں کہ اپنا ووٹ کسے دیں اور کسے نہ دیں؟

۱۷ر جنوری ۱۹۶۲ء

O

اگر ضرورت ایجاد کی ماں ہے تو ماننا پڑے گا کہ " الکشن" ایجاد کا باپ ہے، یعنی اس زمانے میں ایسی ایسی جدتیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ عقل انگشت بدنداں رہ جاتی ہے، اور خامہ سرنگریباں ہو جاتا ہے، یعنی ملاحظہ فرمائیے کہ نیلور میں ایک پارٹی نے بقول شخصے جدت پسندی کی انتہا کر دی یعنی کچھ رکشا چلانے والوں کا سر ایسے حسن کارانہ انداز سے منڈ دیا کہ اس پر پارٹی کا انتخابی نشان بن گیا! اور اسے دیکھ کر لوگوں نے کافی بصیرت حاصل کی۔

آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ جب کوئی جیتا ایجاد ہوتی ہے تو اس کی تقلید بھی کی جاتی ہے۔ چنانچہ جب دوسری جماعت نے دیکھا کہ حریف لوگوں کا سر منڈوا کر اس پر اپنا انتخابی نشان بنا رہا ہے تو انھوں نے بھی اپنے والینٹروں کے سروں کو تختہ مشق بنا ڈالا، اور اب اس علاقے میں ایسے بے شمار رائے دہندے ہیں جو اپنے اپنے سروں پر ترازو سے لے کر ہاتھی اور بیل تک لئے پھر رہے ہیں۔

پرانے محاورے کے مطابق جب بعض لوگ سر منڈواتے تھے تو اولے پڑتے تھے، اب دنیا اتنی ترقی کر گئی ہے کہ سر منڈوانے کے بعد اس پر انتخابی نشان ابھر آتا ہے، اگر ترقی کی رفتار یہی طرح جاری رہی تو وہ دن دور نہیں جب لوگ سر منڈوانے کے بعد آئینہ دیکھیں گے تو پتہ چلے گا کہ ان کے سر پر اچھا خاصہ پولنگ بوتھ قائم ہے۔

۲۰ر فروری ۱۹۶۲ء

حیرت زدہ ہو جانا ہر انسان کا فطری حق ہے، چنانچہ ایک تازہ اطلاع کے مطابق لکھنؤ کے ہجڑوں نے جب دیکھا کہ ان کے نام رائے دہندہ کی حیثیت سے مردوں کی فہرست میں لکھے ہوئے ہیں تو وہ بھی حیرت زدہ ہو گئے۔ صرف یہی نہیں انہوں نے اصرار کیا کہ ان کے ناموں کو خواتین کی فہرست میں جگہ دی جائے مگر وائے ناکامی کہ قانون نے ان کا ساتھ نہ دیا۔

یہاں ہمیں قانون پر سخت اعتراض ہے، ذرا غور فرمائیے جب یہ ہجڑے حضرات خود یہ چاہتے ہیں کہ انھیں عورت سمجھا جائے تو پھر قانون کو کس قانون کی رو سے یہ حق حاصل ہے کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی کارروائی کرے؟

خیر انتخابات کا مرحلہ گزر جانے کے بعد اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہیئے۔ چونکہ ہجڑوں کی تعداد کافی ہے اور اس مد کے تعلق سے یہ فیصلہ ہونا ضروری ہے کہ ؎

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

یعنی ان کی کوئی جنس قطعی طور پر متعین ہونی چاہیئے۔

۲۱ر فبروری ۱۹۶۲ء

○

دو تازہ خبریں ایسی ہیں جس پر پورے عالم انسانیت کو اظہار مسرت کرنا چاہیئے، اور اگر پورا قہقہہ لگانا ممکن نہ ہو تو کم از کم مسکرا لینے میں کوئی ہرج نہیں اس سلسلے کی پہلی خبر تو یہ ہے کہ جنیوا میں جو ۱۷ طاقتی کانفرنس ہو رہی ہے اس کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید دنیا کے بڑے دل کے بڑے بھی ہو جائیں اور ترک اسلحہ پر امریکہ اور روس میں کوئی مناسب سمجھوتہ ہو سکے!

واقعہ یہ ہے کہ انسان اور ہتھیار کے درمیان جو تعلق ہے وہ بہت ہی قدیم ہے بلکہ

بعض محاورہ پسند لوگ تو اُسے چولی اور دامن کا ساتھ کہتے ہیں ان کی تحقیق یہ ہے کہ انسان روزِ ازل ہی سے اسلحہ کا شائق رہا ہے، پھر جب وہ اس دنیائے آب و گل میں آیا تو اس نے یہاں بھی ہتھیاروں کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور وہ اصولِ ارتقار کے تحت اسلحہ سازی اور اسلحہ نوازی (بروزن طبلہ نوازی) میں برابر ترقی کرتا رہا، اس طویل مدت میں فرق صرف اتنا ہوا کہ پہلے وہ اپنے ہتھیار محض جنگلی سوروں، ریچھوں اور گینڈوں کو مارنے کے لئے استعمال کرتا تھا اور اب ایٹم بم بغل میں دبائے پھرتا ہے کہ اگر کوئی ایسا انسان نظر آئے جس کا نقطۂ نظر مختلف ہو تو اُسے جہنم واصل کر دیا جائے۔

دوسری خوشخبری جس کی جانب ہم اپنے قارئین کو توجہ دلانا چاہتے ہیں یہ ہے کہ ڈاکٹر آرتھر کامپٹن کا جو ایٹم بم کے موجد تھے، انتقال ہو گیا ہے۔ ازراہ موصوف کی موت پر خوش ہونا چاہئے، موت تو پالتو کتے کی بھی اذیت رساں ہوتی ہے، چہ جائیکہ ایک سائنسداں جس نے ایٹم بم ایجاد کیا، اور ساری دنیا میں نام کمایا، یہاں ہمارا مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ دنیا میں جو پیدا ہوا ہے وہ ضرور مرے گا چاہے وہ کتنا ہی بڑا موجد کیوں نہ ہو، یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ ہمارے خیال سے مثنوی زہرِ عشق کا مصنف بھی متفق ہے، چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

دوسرے مصرعہ پر ان لوگوں کو غور کرنا چاہیئے جو ایٹم بم اور دوسری خطرناک چیزیں ایجاد کرنے کی فکر میں آج بھی لگے ہوئے ہیں۔

۱۷ مارچ سنہ ۱۹۶۲ء

○

آپ جانتے ہیں کسی گول سوراخ میں چوکور چیز رکھنے کی کوشش کتنی مضحکہ خیز ہوتی ہے، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ مضحکہ خیزی ہماری زندگی کا جزو بن گئی ہے اور اس کا مظاہرہ

ہمارے نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں زمانہ قدیم سے آج تک ہوتا چلا آرہا ہے!

گزشتہ زمانے میں ہمارے یہاں اس بات کی کوشش ہوتی تھی کہ دفاتر کی زیادہ سے زیادہ ملازمتیں ان لوگوں کو ملیں جو موزوں اور مناسب صلاحیتیں نہ رکھتے ہوں، یا غیر ضروری قابلیت کے حامل ہوں، مثال کے طور پر ایک صاحب جو کیمسٹری کے پروفیسر تھے دارالقضات کے ناظم بنا دیئے گئے تھے، ایک "ماہر قانون" صدر مدرس تھے ایک فلسفہ کے اسکالر صاحب تعلقداری کرتے کرتے "انتقال فرما گئے" اسی طرح دوسری ملازمتوں میں بھی یہ نکتہ ملحوظ رکھا جاتا تھا کہ اگر کوئی شخص سائنس داں ہے تو اسے کوئی ایسی ملازمت نہ دی جائے جس میں سائنس کی ضرورت ہو یا اگر کسی نے انجینئرنگ میں مستند حیثیت حاصل کی ہے تو اسے انجینئر ہرگز نہ بنایا جائے!

تقررات اکثر و بیشتر ضرورت کی بجائے شخصیت پر منحصر ہوتے تھے۔ یا کسی سفارش کو پیش نظر رکھ کر کئے جاتے تھے، یا پھر ان میں شخصی تعلقات کی کارفرمائی شامل رہتی تھی، یہ صورتحال کہیں اب بھی باقی ہے، مثال کے طور پر چند روز پہلے ایک دفتر میں جب ایک خوشنویس کا انتقال ہوا تو اس سے پہلے کہ اس بیچارے کی تجہیز و تکفین ہو سکے، ایک صاحب جنھیں خوشنویسی کی الف، بے بھی نہیں آتی تھی! اور جو محکمہ مال کے وظیفہ یاب تحصیلدار تھے محض "مقامہ آمدنی" کی خاطر اپنا تقرر خوشنویسی کی اس جگہ پر کرالائے، آپ اندازہ لگایئے کہ کدھر تحصیلداری اور کدھر خوشنویسی۔

ہمارے نظم و نسق سے جب تک اس قسم کا "گول مول" ختم نہیں ہوتا، کارکردگی کس طرح پیدا ہوگی اور کس طرح بڑھیگی۔

۲۰ مارچ ۱۹۶۲ء

○

زندگی کی ایک ٹریجڈی (یا کامیڈی) یہ بھی ہے کہ انسان خود ہی قانون بناتا ہے اور

خود ہی اُسے توڑ کر پھینک دیتا ہے' اور تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جیسے جیسے وقت کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں' قانون سازی اور قانون شکنی کی نوعیت بھی بدلتی جاتی ہے' ایک زمانہ تھا جب کبھی فردِ واحد کی تنہا مرضی قانون کا درجہ رکھتی تھی اور وہی فردِ واحد جب چاہتا تھا قانون یا اپنی مرضی کا گلا گھونٹ دیتا تھا' اور اس کی جگہ دوسرا قانون یا دوسری مرضی نافذ ہو جاتی تھی!

پھر قانون بنانے اور انھیں توڑنے کے نئے نئے طریقے ایجاد ہونے لگے جن کے مظاہرے آج کل ساری دنیا میں دیکھے جا سکتے ہیں' مثال کے طور پر آپ کو معلوم ہی ہے کہ گزشتہ انتخابات میں ہم نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے ملک بھر میں جو اسمبلیاں بنائی ہیں وہ بہت جلد قانون سازی کا سلسلہ شروع کرنے والی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ قانون شکنی کا سلسلہ پہلے ہی سے جاری ہے' یہاں ایک منٹ ٹھہر کر ہمیں اس نکتہ پر غور کر لینا چاہیے کہ آج کل قانون کی ضرورت نازمانہ پڑتی ہے' لیکن قانون شکنی اس قید سے آزاد ہے' یعنی جب تک آپ قانون کی زد میں نہیں آتے ہر قانون کو توڑ کر موچھوں پر تاؤ دیتے رہیے۔

پھر جو لوگ قانون توڑنے کا پیشہ کرتے ہیں' (مخفی مباد کہ ہمارے یہاں انسانوں کے سر توڑنا بھی ایک پیشہ ہے) وہ ہمیشہ اس احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ وہی قانون زیادہ سے زیادہ توڑا جائے جس کے توڑنے سے کوئی مالی فائدہ حاصل ہوتا ہو' یہی وجہ ہے کہ حکومت نے درآمد و برآمد کے لیے جو قوانین بنائے ہیں' وہ ہمیشہ پیشہ ور قانون شکنوں کی زد میں رہتے ہیں' اور اس طرح باشندگان ملک کی مالی حیثیت روز بروز بہتر ہوتی جا رہی ہے۔

۲۵ مارچ ۱۹۶۲ء

○

اِن سائنس دانوں اور ڈاکٹروں کا بھی کوئی جواب نہیں جو آئے دن نئے نئے انکشافات کر کے عوام کو خوف زدہ کرتے رہتے ہیں' انھیں ہر شے میں کسی نہ کسی بیماری کے جراثیم ضرور نظر

آجاتے ہیں۔ انھیں ڈاکٹروں میں نوبل پرائیز یافتہ ڈاکٹر البرٹ شوئسٹر بھی شامل ہوگئے ہیں اور اپنے ایک عمدہ دہشت انگیز اور زلزلہ خیز بیان کے ذریعہ آپ نے بتایا ہے کہ نمک کھانے سے کینسر کا مرض پیدا ہوتا ہے!

نمک کا استعمال ساری دنیا میں عام ہے خاص کر ہمارے ہندستان میں تو ہر چھوٹا بڑا بڑے شوق سے نمک کھاتا ہے اور اپنی نمک خواری پر فخر کرتا ہے ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ مذکورہ خطرناک مرض ہمیں لوگوں میں زیادہ پھیلنا چاہیئے اس لئے کہ ہم وہ لوگ ہیں جو ہر حال میں نمک کا پاس رکھتے ہیں اور نمک حرامی کرنا بہت معیوب سمجھتے ہیں!

لیکن اگر چھان بین کی جائے اور اعداد و شمار جمع کئے جائیں تو پتہ چلے گا کہ ہمارے ملک میں کینسر کا مرض اتنا عام نہیں ہے جتنا کہ غیر نمک خوار ممالک میں پایا جاتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آج کل عمل اور ردعمل کا سلسلہ نئی صورت اختیار کر گیا ہے یعنی نمک تو کھاتے ہیں ہم اور کینسر ہوتا ہے دوسرے لوگوں کو۔

۱۵ اپریل ۱۹۶۲ء

○

نام و نشان کے انتخاب میں افراد اور ادارے یکساں آزاد ہیں۔ مثلاً آپ اپنے لڑکے کا نام امیر خاں بھی رکھ سکتے ہیں اور فقیر بیگ بھی، لیے لکشمی پرشاد بھی کہہ سکتے ہیں اور بھگوڑی مل بھی اسی طرح کوئی ادارہ اگر چاہے تو اپنے لئے سورج کو بطور نشان پسند کر سکتا ہے یا پھر مینڈک کو ترجیح دے سکتا ہے!

ایسے عالم میں ہمیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ پاکستان میں قومی اسمبلی کے لئے جو امتیازی نشانات طے پائے ہیں ان میں حقہ بھی ہے بلکہ ہم اس امیدوار کی خوش مزاجی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے جس نے نشان امتیازی کے طور پر حقہ کو ترجیح دی ہمیں یقین ہے کہ یہ شخص اگر لکھنؤ کا باشندہ نہیں ہے تو کم از کم لکھنوی خمیرے کا لطف ضرور اٹھا چکا ہے یا خود اس کا خمیر

لکھنو کی خاک سے اٹھا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص حقہ پیتا ہے۔ وہ قومی اسمبلی میں جاکر ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر قومی خدمت کر سکتا ہے جو محض بیڑی کے پتے پر اکتفا کرتے ہیں یا صرف پان چباتے پھرتے ہیں!

ان حقہ والے امیدوار کی طرف سے روزنامہ جنگ کراچی کی اشاعت مورخہ ۲۳ اپریل میں ایک اشتہار طبع ہوا ہے جسے ہم اپنے قارئین کی تفریح طبع کے لیے یہاں درج کرتے ہیں ملاحظہ ہو!

حلقہ انتخاب ۷۱ کے بنیادی جمہوریت کے ارکان سے غالب کا خطاب

حقہ جو ہے حضورِ معلیٰ کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

حقہ ہماری سماجی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے! اپنے ووٹ کا صحیح استعمال کیجئے!

اس اشتہار کے ایک گوشے میں حقے کی تصویر بھی بنی ہے جس کی چلم سے دھواں نکل رہا ہے۔

اس اثنا میں دو باتیں بہت نازک اور بلیغ ہیں ایک تو یہ کہ قومی اسمبلی کے انتخابات کی ہنگامہ آرائی میں غالب کی روح پر فتوح سے استمداد کیا گیا ہے اس کی تہہ میں یہ تصور کارفرما ہو سکتا ہے کہ جو امیدوار غالب کو اس کشمکش میں گھسیٹ لائیگا۔ اس کا غالب رہنا بدرجہ ادنیٰ ممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بہت دن بعد اس اشتہار کے ذریعہ سے حقہ کی سماجی اہمیت کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے امید ہے کہ امیدوار موصوف الکشن کے اختتام تک اپنے تمام ووٹروں کو حقہ پلاتے رہیں گے تاکہ سماجی اہمیت کے ساتھ حقہ کی انتخابی عظمت بھی واضح ہو جائے۔

۲۹ اپریل ۱۹۶۳ء

○

ہمیں اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ صدر ایوب خاں نے مسٹر سہروردی کو گرفتار

کر کے جیل میں ڈال دیا ہے اس لئے کہ ہم انسان کی آزادی کو سب سے بڑی نعمت سمجھتے ہیں (جرائم پیشہ لوگ مستثنیٰ ہیں) مگر جب ہمیں اس اہتمام کی تفصیلات معلوم ہوئیں جو سہروردی صاحب کی سکونت کے لئے کراچی سنٹرل جیل میں کیا گیا ہے۔ تو نہ صرف یہ کہ ہماری آنکھیں کھل گئیں بلکہ ہمارا افسوس بھی کئی ڈگری اتر گیا' بلکہ کم ہو گیا' ذمہ دار ذرائع سے خبر آئی ہے کہ جیل کے جس حصے میں مسٹر سہروردی اقامت گزیں ہیں اُسے ایر کنڈیشنڈ بنا دیا گیا ہے اور آپ کی دلچسپی کا پورا سامان وہاں بہم پہنچا دیا گیا ہے۔ اس میں دو بولتی ہوئیں مینائیں اور ایک طوطا بھی شامل ہے۔

اور سنا ہے کہ موصوف کا کھانا گھر سے پک کر آتا ہے جس میں انواع و اقسام کے ڈش ہوتے ہیں' مثلاً قورمہ۔ پلاؤ' شب دیگ' شیر مال کئی قسم کی سبزیاں' چٹنی' اچار' مربے اور حلوے وغیرہ اور اس کے علاوہ آپ کے لئے بے شمار کتابیں بھی مہیا کر دی گئیں ہیں۔

اللہ اللہ کیا جیل ہے جس پر ہزار آزادیاں قربان کی جا سکتی ہیں' یعنی خوب کھائیے خوب مطالعہ کیجئے اور اوقات فرصت میں منطق الطیر سے بھی جی بہلائیے اس لئے کہ طوطا اور مینا کی کہانیاں ہمارے قدیم ادب کا عظیم سرمایہ ہیں۔

جولائی سنہ ۱۹۶۲ء

○

امریکی ایر فورس کے ایک ترجمان نے حال ہی میں ایک مژدہ جانفزا سنایا کہ ایٹم بم ایسے عہدہ داروں کے حوالے نہیں کیا جائے گا جن کا دماغی توازن مشتبہ ہے جو پاگل ہیں' اس مقصد کے لئے ابھی سے عہدہ داروں کے دماغوں کا بالتفصیل معائنہ کیا جا رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ہمیں صرف دو باتیں عرض کرنی ہیں ایک تو یہ کہ ایسے عہدہ داروں کو امریکی ایر فورس میں جگہ ہی کیوں دی گئی جو مشتبہ قسم کا دماغی توازن رکھتے ہیں یا جنہیں پاگل کہا جا سکتا ہے دوسرے یہ کہ مجوزہ احتیاط کے تحت اگر کسی باشعور ہوشیار اور عقلمند عہدہ دار کو

ایٹم بم دیا جائے اور وہ اُسے چھوتے ہی دیوانہ ہو جائے (جس کا قوی امکان ہے) تو ایسی صورت میں کونسی احتیاطی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں۔

جولائی سنہ ۱۹۶۲ء

○

یہ سوال بہت پرانا ہے کہ انڈا پہلے پیدا ہوا یا مرغی پہلے عالم وجود میں آئی فی الحال تو ہم ماہرینِ فن سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انڈا کس مقصد سے پیدا کیا ہے اگر یہ سوال خود ہم سے کیا جائے تو ہم سوائے اس کے کوئی جواب نہیں دے سکتے انڈا یا تو مرغی کی نسل کو باقی رکھنے کے لئے عالمِ وجود میں آیا ہے یا پھر اس کا حاصل یہ ہے کہ اسے کسی نہ کسی شکل میں معدے کے اندر اُتار لیا جائے کہ اس میں وٹامن کی کافی اور تشفی بخش مقدار پائی جاتی ہے۔

لیکن اِدھر جب سے سیاست میں زندہ دل شامل ہونا شروع ہوئے ہیں انڈے کے کبھی اور انوکھے استعمال نکل آئے ہیں مثال کے طور پر یہ واقعہ ملاحظہ فرمائیے کہ پڑوسی ملک پاکستان کے وزیرِ زراعت مسٹر فضل القادر جب اپنے وطن چٹاگانگ پہنچے تو اُن کا بڑا ہنگامہ خیز استقبال کیا گیا اور ان پر گندے انڈوں کی بارش کی گئی۔

ہمیں موصوف سے شدید ہمدردی ہے اور ہم سوچ رہے ہیں کہ آپ وزیر بننے کے بعد کیا کیا اُمیدیں اور تمنائیں اپنے دلِ نازک میں لئے ہوئے وطن مالوف پہنچے ہوں گے پھولوں کے ہار، خیر مقدمی نعرے تعریفی قصائد پُر تکلف ضیافتیں، ساحرنواز موسیقی' احباب سے تہنیت و مبارک باد' اغیار کی جانب سے شرمندگی و پشیمانی عزیزوں کی مسرتیں دوستوں کی مسرتیں جلسوں کی صدارت اور جلوس کی قیادت لیکن یہ آپ کے سارے ہوائی قلعے مسمار ہو گئے ہوں گے جب ایک انڈا آپ کی پیشانی پر پڑ کر پھوٹ گیا ہوگا آپ کے صاف شفاف کپڑے داغدار ہو گئے ہوں گے۔

خبر میں اس انڈا گردی، برونزن شنڈا گردی کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ موصوف نے

مشرقی پاکستان کے مطالبات منظور ہونے تک وزارت میں شامل نہ ہونے کا وعدہ کیا تھا اور جب آپ اپنے وعدے سے پھر گئے تو عوام الناس نے آپ کی قبا ضخ گندے انڈوں سے کر ڈالی ہم اس وجہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہمارا اندازہ یہ ہے کہ چٹاگانگ کے باشندوں نے یہ شعر سن رکھا ہوگا۔ سہ

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

اور جب وزیر مذکور وہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے سوچا کہ گلی نہ سہی موصوف نہ سہی۔

نظمیں

○

آج کل پورے ملک میں برتھ کنٹرول کے موضوع پر ایک مشاعرہ برپا ہے جتنے منہ ہیں اتنی ہی باتیں ہیں، بلکہ کہیں کہیں تو منہ کم ہیں اور باتیں زیادہ ہیں اور مخالفت اور موافقت کا ہنگامہ جاری ہے۔ اس حالت میں شاعر سیاست کی رگِ شاعری بھی اگر پھڑک اٹھی تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔
ان کی نظم کا موضوع بھی یہی ہے۔

برتھ کنٹرول

وہ ممالک بھی ہیں ظلمت کدہ عالم میں
جن کو بچوں کے تبسّم سے ضیاء ملتی ہے
جب کوئی ماں کسی معصوم کو دیتی ہے جنم
باپ کے دِل کی کلی کھلتی ہے!
دعوتیں ہوتی ہیں
کاگ اُڑتے ہیں
دور و نزدیک عزیزوں کے لئے ہوتی ہے عید
لوگ خوش ہوتے ہیں اور گاتے ہیں

فارسی کے یہ پرانے مصرعے

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست

آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدر

اور ایک ملک ہمارا ہے کہ بس کیا کہیئے

ادھر اک طفل کسی گھر میں نمودار ہوا

اور ادھر فکر بڑھی

باپ گھبرانے لگا رونے لگا

ماں کو اِس بات کا افسوس کہ میں گائے نہیں

دودھ کس طرح پلاؤنگی اسے

جب بڑا ہوگا تو کیا چیز کھلاؤنگی اسے

اس کی تعلیم کہاں سے ہوگی

ہر فرشتے کو یہ حسرت ہے کہ انساں ہوتا

اور انساں کا یہ عالم کہ مرا جاتا ہے

نہ کوئی کام نہ دھندہ نہ مروت، نہ ادا

تم ہی بتلاؤ انھیں چاہیں تو چاہیں کیونکر

گھر میں مفلس کے کسی طفلک ناداں کا وقوع

جبر ہے، قہر خداوندی ہے

دودھ پوڈر کا بھی ملتا نہیں آسانی سے

اور بچہ ہے کہ زندہ ہے گراں جانی سے

دانت نکلیں گے تو پھر کھائیگا سوکھے ٹکڑے

اپنے والد کو بھی کھلوائے گا سوکھے ٹکڑے

پھر کسی روز چرائے گا کسی کے پیسے

اور حوالات کا منہ دیکھے گا

اسی عالم میں گذر جائے گا جیون اس کا

شاخِ غربت ہی پہ قائم ہے نشیمن اس کا

میں یہ کہتا ہوں کہ بچوں کی ضرورت کیا ہے

اور میرے ملک کو اولاد کی حاجت کیا ہے

اس میں پہلے ہی سے آباد ہیں لوگ

جن میں لیڈر بھی ہیں نقال بھی ہیں۔

گانے والے بھی ہیں قوال بھی ہیں

حکما بھی ہیں یہاں وید بھی ہیں

جیب کترے بھی ہیں اور تاجر بھی ہیں

اور پھر شاعر و صورت گر و افسانہ نویس

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اس کو سمجھاؤ کہ اعصاب سے نیچے اترے

ورنہ بچوں کی ولادت نہ رکے گی ہرگز

کشتیٔ قوم و وطن پار نہ ہوگی ہرگز

آج حالات و حقائق کا تقاضہ یہ ہے

قصرِ اولاد کے در بند ہوں بھوکوں کے لیے

ماں کی آغوش میں بچہ نہ ہمکے

باپ کی گردن نہ پھنسے

جتنے انسان میرے ملک میں ہیں

دبی کانی سے زیادہ ہیں تقدیم
میں نہ ملا ہوں نہ شاعر، نہ حکیم
بخت نے صاحبِ اولاد کیا ہے مجھ کو
کشتۂ کثرتِ تعداد کیا ہے مجھ کو
صحن میں کھیلتے پھرتے ہیں میرے دس بچے
اور سب چیخ رہے ہیں کہ ہمیں روٹی دو
ان کا کیا ہوگا بھلا میرے بعد
کسی کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

۸ رجنوری ۱۹۶۱ء

○

آج کل آزاد نظم کا وزن دورہ یا صحیح الفاظ میں وزن کم ہے اور دورہ زیادہ ہے یعنی جسے دیکھئے ایک آدھ آزاد نظم بغل میں دبائے ہوئے صفِ شعراء کی زینت بن جاتا ہے جب صورتِ حال یہ ہے تو شاعرِ سیاست کو اس حرکت سے باز رکھنا ہمارے بس کی بات نہیں چنانچہ موصوف کے انکارِ تازہ حسبِ ذیل ہیں۔

نمائش اور مشاعرہ

آج مجمع ہے نمائش میں سخنوروں کا
شمع تخیل کے پروانوں کا
اور نمائش کی وہ سج دھج ہے کہ اللہ غنی
ہے کہیں گلبدنی اور کہیں گل پیرہنی
کہیں احباب کی دھوم
کہیں بچوں کا ہجوم
کوئی آتا ہے تو پھر بھیڑ میں کھو جاتا ہے

کہیں بجھیئے کی دوکانیں کہیں رگڑے کا مزا
کسی فن کار کو خلعت کسی غنڈے کو سزا
شور و ہنگامہ بھی ہے اور دھکا پیل بھی ہے
کچھ مسافر بھی ہیں اک ریل بھی ہے
ایک طرف شعر کی وہ بزم کہ بس کیا کہیئے
یعنی ہر چکنی سپاری کو سویدا کہیئے
شعرا آتے ہیں اور ڈٹ جاتے ہیں
کچھ نئے شعر بھی فرماتے ہیں
گونج اٹھتی ہے ترنم کی صدا
سننے والوں کے تکلم کی صدا
داد دیتے ہیں اس انداز سے سننے والے
جیسے غصے میں کوئی حاکم وقت
ذرا انتظار رہتا ہو ماتحتوں کو
اور شاعر ہے کہ تسلیم بجالاتا ہے
شعر کو دھراتا ہے
انہی لوگوں سے تو قائم ہے ادب کا بازار
ہیں یہی جان بہار
نہ خوشی سے انھیں مطلب نہ تعلق غم سے
زندہ ہے ملت بیضا شعرا کے دم سے
یہی ہر وقت خموشی میں صدا دیتے ہیں
دشت ظلمات میں گھوڑوں کو بھگا دیتے ہیں

محفلِ شعر و سخن برپا ہے
اور ہر شخص یہی کہتا ہے
کیوں ریاکار بنوں سود فراموش رہوں
ہوشیاری کا تقاضا ہے کہ بےہوش رہوں
جب کوئی کام نہ ہو
شعر کہنے میں مزہ آتا ہے
اور سننے میں بھی ہے لذتِ نو
آؤ پھر شعر کہیں شعر کہیں
بھول جائیں کہ حقیقت کیا ہے
وقت اور اس کی ضرورت کیا ہے
جب کوئی شعر پڑھے ہم کہیں سبحان اللہ
آسماں سے یہ صدا آئے کہ انا اللہ

۱۵ جنوری ۱۹۶۱ء

○

بعض لوگ کہتے ہیں کہ کرکٹ اصل میں گلی ڈنڈے کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے مگر خاکسار کو کن کو اس تحقیق سے انکار ہے اس لئے کہ گلی ڈنڈے اور کرکٹ میں سماجی حیثیت میں کوئی ہم آہنگی نہیں مطلب یہ کہ گلی ڈنڈا عموماً کم حیثیت لونڈے کھیلتے ہیں جبکہ کرکٹ کے کھلاڑی شہرہ آفاق درجہ رکھتے ہیں آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ کوئی نوجوان جو مثلاً اعلیٰ قسم کا ٹویڈ سوٹ زیب تن کئے ہوئے گلی ڈنڈے سے شوق فرما رہے ہیں یا کوئی گھٹیا جانگیہ پہنے ہوئے کرکٹ میں مصروف ہے خیر اس بات کی تحقیق کہ گلی ڈنڈے اور کرکٹ میں کسی قسم کا تعلق پایا جاتا ہے کوئی ایسے ریسرچ اسکالر صاحب کرسکیں گے جنہوں نے اسپورٹ کو اپنا موضوعِ سخن بنا رکھا ہے۔

ہم آپ تک یہ خوشخبری پہنچانا چاہتے ہیں کہ حیدرآباد میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کی آمد کا حال سن کر

شاعر سیاست نے ایک نظم موزوں فرما ڈالی ہے اور چونکہ پاکستانی کرکٹ کھلاڑیوں کو بھی شعر کا ذوق ہے بلکہ ان میں سے ایک صاحب تو سنا ہے کہ شاعری میں بھی سنچری بنا چکے ہیں اس لئے امید ہے کہ یہ نظم فریقین میں دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ ملاحظہ ہو عنوان ہے

باؤنڈری

وہ دیکھو ادھر فتح میدان ہے
جہاں آج کرکٹ کا گھمسان ہے
اِدھر گیند ہے اور بلا اُدھر
پریشاں ہے سارا محلہ اُدھر
کھلاڑی کھڑے ہیں اکڑتے ہوئے
سنورتے ہوئے اور بگڑتے ہوئے
لچکتے ہوئے گنگناتے ہوئے
اشاروں میں سیٹی بجاتے ہوئے
تماشائیوں کا عجب حال ہے
کہیں قیل ہے اور کہیں قال ہے
وہ خوش ہے جگہ جس کو اچھی ملی
کہ پہلی ہی لائن میں کرسی ملی
مگر جس کو پیچھے کا صوفہ ملا
ہے اس کی نگاہوں سے ظاہر گلا
اکیلا کوئی آگیا ہے یہاں
کسی کے جلو میں ہے کُل خاندان

کوئی اپنے بچوں کو لایا ہے ساتھ
وہ عالم ہے گویا کسی کی برات
غرض دیکھیے کھیل ہونے لگا
کھلاڑی بڑھے میل ہونے لگا
ہوا میں چلی گیند اڑتی ہوئی
کبھی سیدھ میں گاہ مڑتی ہوئی
کبھی یہ کھلاڑی کو رن دے گئی
کبھی ساتھ اپنے وکٹ لے گئی
کبھی یہ کسی کے کمر میں لگی
ذرا اور اچھلی تو سر میں لگی
کوئی جم گیا کوئی آؤٹ ہو گیا
کبھی ریفری غرقِ ڈراوٹ ہو گیا
کسی نے وہ چوا بنایا کہ واہ
کسی نے وہ بلا گھمایا کہ واہ
کوئی بھاگتے میں پھسل کر گرا
کوئی از سرِ نو سنبھل کر گرا
کہیں گیند کو کیچ کرنے کی دھن
کہیں صرف بننے سنورنے کی دھن
دعا ہے کہ یہ کھیل جاری رہے
نگاہوں پہ اک کیف طاری رہے

نتیجہ نکل آئے معقول سا
نہ بیکار سا اور نہ مجہول سا
کہیں حسب سابق یہ عالم نہ ہو
کہ بعد اس کے دل کی خلش کم نہ ہو
شکست و ظفر کچھ تو جلوہ دکھائے
کسی کو یہ کہنے کی نوبت نہ آئے
یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ ہر کھیل اپنا ڈرا ہو گیا

۲۱ر جنوری ۱۹۶۱ء

○

شاعر سیاست نے بہت دن بعد ایک آزاد نظم لکھی ہے جسے ہم قارئین سیاست کی خاطر یہاں درج کرتے ہیں، عنوان ہے :

گدھا اور لاش

ایک جنگل میں جہاں بول رہے تھے اُلو
اور فضائیں تھیں خموشش
میں نے ایک گدھے سے پوچھا کہ سن اے جان وفا
تو ہے سرمایہ ہوش
سب پرندوں میں تری عمر بڑی ہوتی ہے
بیٹھ جاتا ہے جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
روز پڑتی ہیں حقارت کی نگاہیں تجھ پر
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے
اے خردمند عزیز

سچ بتا مجھ کو کہ تو
کونسی لاش کو کھاتا ہے مزے لے لے کر
یوں تو جنگل میں ہیں حیوان بہت
ان میں ہاتھی بھی ہیں اور شیر بھی ہیں
بارہ سنگھے بھی ہیں اور چیتے بھی
نیل گائیں بھی ہیں اور بھینسے بھی
چرنے والے بھی ہیں اور پرندار بھی ہیں
رینگنے والے بھی ہیں اور گلدار بھی ہیں
تجھ کو کس لاش کے کھانے میں مزہ آتا ہے ؟
میرے ہونٹوں پہ پھر اک حرفِ وفا آتا ہے
گدھ نے مجھ سے یہ کہا
اے احمق ، اے ناداں ، اے او دیوانے
میں پرندہ ہوں میرے راز کو تو کیا جانے
لاش انسان کی ہوتی ہے مزے دار بہت
اس میں ملتے ہیں کئی قسم کے اسرار بہت
اس میں شامل ہے ہرن کی لذت
یعنی کل دشت و دمن کی لذت
میں کسی لاش کو چھوتا ہی نہیں
جب میسر ہو مجھے
کوئی افلاس کا مارا ہوا کمزور انسان
یا تجھ سا مظلوم و مجہول

اِسی باعث تو کہی ہے یہ بات
مرزا نوشہ نے جو ایک شاعر تھے!
کبھی گدھے کو بھی اِس بات پہ دھوکہ نہ ہوا
آدمی بن کے رہا وہ جو فرشتہ نہ ہوا

۲۶ جنوری ۱۹۶۱ء

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "کنونشن" کی بات ہندستان سے نکل کر چاردانگ عالم میں پھیل گئی ہے، اور یہ طریقہ کار لوگوں کو اِس قدر پسند آیا کہ اب مختلف ممالک میں کنونشن کے نام سے وقت گذاری کی کوشش ہو رہی ہے، یہاں تک کہ جنوبی افریقہ میں غیر یورپی "لوگوں کا ایک کنونشن ہونے والا ہے، لیکن حالات کچھ ایسے ہیں کہ شاید یہ کنونشن ہوتے ہوتے رہ جائے۔ کنونشن ایک ایسا لفظ ہے جو چند برس پہلے ہمارے لئے بالکل نامانوس تھا لیکن اب ہم اِس سے اتنے مانوس ہوگئے ہیں کہ ہر اجتماع پر خواہ وہ جلوس جنازہ ہی کیوں نہ ہو کنونشن کا دھوکہ ہوتا ہے، اور اگر کوئی شخص راستے میں خیریت دریافت کرے تب بھی جواب میں "کنونشن" کا لفظ ہی منہ سے نکلتا ہے، سنا ہے کہ بعض لوگ سوتے میں بڑبڑاتے رہتے ہیں کنونشن، کنونشن، کنونشن!

اور اب کہ جنوبی افریقہ میں "غیر یوروپی" لوگوں کا کنونشن ہونے والا ہے، اُسے ارباب ذوق کے لئے "صلائے عام" سمجھنا چاہیئے، جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے اسی طرح ایک کنونشن دوسرے کنونشن کا راستہ ہموار کر سکتا ہے، اور کیا عجب ہے کہ کل ہماری ریاست میں بھی اسی قسم کے کنونشن ہونے لگیں اور ہمارے یہاں کی چہل پہل میں اضافہ ہو جائے!

اس سلسلے میں سب سے سب سے پہلے تو غیر مذہبی لوگوں کا ایک کنونشن ہونا چاہیئے کہ "غیر ملکی لوگوں" کا بھی کنونشن ہو جائے اس کے بعد غیر ملکی لوگوں کے کنونشن کی تجویز ضروری ہے

اور آخر میں "غیر علمی لوگوں" کو بھی کنونشن کر لینے دیا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔

جب شاعرِ سیاست کو پتہ چلا کہ آجکل ملک میں "کنونشن" کی گرم بازاری ہے وہ خاموش نہ رہ سکے فکرِ سخن میں مصروف ہو گئے۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے!

کنونشن

ایک دن اپنے گھر میں سو رہا تھا بے خبر
دفعتاً سوچا کہ کنونشن منانا چاہیئے
کھل گئی پھر میری آنکھ
ہر طرف پھیلی ہوئی تھی چاندنی
جیسے شاعر کا بڑھاپا جیسے بیوہ کا شباب
جیسے بنیئے کا رجسٹر جیسے منطق کی کتاب

ان مناظر نے پریشاں کر دیا
دل کو وقفِ یاس و حرماں کر دیا
میں نے لوگوں کو بلایا اور ان سے یہ کہا
زندگی میں اپنی کنونشن نہیں تو کچھ نہیں
اور جوانی میں رسیلا پن نہیں تو کچھ نہیں
آؤ کنونشن کریں دھومیں مچائیں
کچھ نہیں ممکن تو قوالی ہی گائیں!
زندگی کا لطف کنونشن سے ہے
شاعری کا لطف کنونشن سے ہے
بے خودی کا لطف کنونشن سے ہے

کتنی قومیں مٹ گئیں اِس خاندانِ دہر میں
کتنے ملکوں میں قیامت آگئی
اف وہ دِل جو بے نیازِ سلطنت کنونشن رہے
اور ہمیشہ مبتلائے نالۂ وشیون رہے
ان سے محشر میں یہ پوچھا جائے گا
تم نے کنونشن کیا تھا یا نہیں
تب یہ کیا دیں گے جواب
پھر انھیں دوزخ میں ڈالا جائے گا!
آمد و رفتِ نفس ہے زندگی
زندگی کا قافیہ شرمندگی
دوزخی جتنے ہیں سب مل کر یہ مصرعہ گائیں گے
"اے ہجومِ نامرادی جی بہت گھبرائے ہے"
جاگ اے اہلِ وطن ہوشیار ہو ہوشیار ہو
بہرِ کنونشن ابھی تیار ہو، تیار ہو
باندھ لے اپنی کمر
کوئی رسی ڈھونڈھ کر
جن کو دنیا میں نہیں ہے کوئی کام
ان کو لازم ہے کہ کنونشن کریں
اور وطن کے نام کو روشن کریں

۱۹ر جولائی ۱۹۶۲ء

پیارے قارئین کرام اگر آپ آج کے دن ٹھنڈے دل سے غور کریں تو اس نتیجہ تک پہونچنا ناگزیر ہے کہ دراصل ۱۵ اگست ہی ہماری قومی عید ہے ہمارے ملک میں کئی مذاہب آباد ہیں اور ان کی مختلف عیدیں آتی رہتی ہیں ۔ مثلاً عید الفطر آتی ہے اور ہولی آتی ہے۔ ان میں بھی ہمارے یہاں یکجہتی کے مظاہرے دیکھے جاتے ہیں یعنی عید الفطر کے موقع پر ہندو حضرات اپنے مسلمان بھائیوں کے گلے ملتے ہیں عطر اور پان قبول کرتے ہیں، اسی طرح مسلمان دیوالی کے موقع پر ہندو دوستوں کے مہمان ہوتے ہیں، مٹھائی کھاتے ہیں اور ان کے تہوار میں حصہ لیتے ہیں پھر بھی اس نوعیت کے تہواروں کی تہہ میں ایک مذہبی تصور کارفرما رہتا ہے۔ انصاف سے دیکھا جائے تو ۱۵ اگست ہی ہمارے ملک کا واحد قومی تہوار ہے یہی عید ہے جو سب کے لئے ہے ۔ اور سب کی طرف سے منائی جاتی ہے ۔

ابھی ہم یہیں تک لکھنے پائے تھے کہ شاعر سیاست بغل میں ایک آزاد نظم دبائے ہوئے تشریف لے آئے موصوف کا کہنا ہے کہ آزادی کے مسرت بخش موقعہ پر ایک ایسی نظم کی اشاعت ضروری ہے جو خود بھی آزاد ہو جس میں آزادی کے موضوع پر نئے زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ ملاحظہ فرمائیے :

للہ الحمد کہ افرنگ کا جادو ٹوٹا
ہند آزاد ہے آج
شاد و آباد ہے آج
ملک اپنا ہے زمیں اپنی ہے، سب اپنے ہیں !
نہ غلامی کی وہ لعنت ہے نہ انگریز کا خوف
کوئی گورا کسی کالے پہ جھپٹتا ہی نہیں
اب انگوٹھا کسی صناع کا کٹتا ہی نہیں
جس طرف دیکھئے ہنگامۂ آزادی ہے

کہیں شادی کا ارادہ ہے کہیں شادی ہے
جوش جو دل میں ہے پابند خرد ہے کہ نہیں
اپنی آزادی کی یا رب کوئی حد ہے کہ نہیں
شاعر آزاد ہیں اشعار چرانے کے لئے
لڑکیاں ملک کی آزاد ہوئی ہیں اتنی
بھاگ جاتی ہیں کسی عاشق جانباز کے ساتھ
اور ماں باپ یہ کہتے ہیں کہ اب کیا ہوگا — ؟
بھائی صاحب کی زباں پر ہے کسی کا مصرعہ
"آکے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد"
لوگ آزاد ہیں دفتر کو بھی جائیں کہ نہ جائیں
اور جائیں بھی تو کچھ کام کریں یا نہ کریں
راستے بند ہیں فٹ پاتھ پر بابا تیں ہیں
"کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں"
تاجر آزاد ہیں قیمت بڑھانے کے لیئے
حاکم آتے ہیں غریبوں کو ستانے کے لیے
نقشِ آزادیٔ افکار بہت مدھم ہے
پان کی پیک سے سڑکوں کا عجب عالم ہے
دیکھیے سلسلۂ آزادی

دل میں لالچ ہے بدن پر کھادی
اتنے آزاد ہوئے ہیں ہم لوگ
نہ کوئی حد نہ کوئی پابندی

تیل کو گھی میں ملا دیں تو وہ پھر بھی گھی بن جائے۔

دودھ سے پینے سے فقط پیاس ہی بجھ سکتی ہے

علم آزاد ہے گمراہ کرے لوگوں کو

فیس اتنی ہے مدرسوں میں کہ بس کیا کہیے

اور تعلیم کو لڑکوں کا تماشا کہیے

فلم سازوں کو ملی دولت آزادیٔ فن

پنڈلیاں ہیں کہیں ننگی، کہیں عریاں ہیں بدن

جی میں جو آئے کرو!

بات اچھی نہ سنو!

اور کچھ کام نہیں ہے تو کرو اسمگلنگ

اس کو مارو، اسے پیٹو، مجھے گالی دے دو

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

آج آزاد ہیں ہم

خرم و شاد ہیں ہم

تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے۔

لوگ لیٹے بھی ہیں، آزاد بھی ہیں

سینہ کس کا ہے، مری جان جگر کس کا ہے۔

۱۵ راگست ۱۹۶۱ء

○

عام انتخابات کے قرب کے باعث پورے شہر میں چہل پہل گھما گھمی پیدا ہو رہی ہے جو لوگ کسی نہ کسی ایوان میں نشست کے امیدوار ہیں انہوں نے ابھی سے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا ہے اور جن کے لئے انتخابات کی زمین سخت ہے اور آسمان دور ہے، وہ

شور و غل میں مصروف ہو گئے ہیں غرض بقول شاعر ؎

عروقِ کہنہ و مردہ میں خونِ زندگی دوڑا

جب ملک کا یہ حال ہو یعنی یہ کہ وہ ایک نئے انتخاب کے دروازے پر کھڑا ہو تو شاعر جیسی حساس اور ذی روح مخلوق خاموش نہیں رہ سکتی چنانچہ شاعر سیاست دلی بھی اپنا پیشہ ورانہ فریضہ ادا کرنے کی نیت سے ایک آزاد نظم سپرد قلم فرمائی ہے جسے ہم ان سطور کے ذریعہ سپردِ قارئین کرتے ہیں۔ عنوان ہے۔

انتخابات

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
اس میں ایک غالبؔ مغفور رہا کرتے تھے
ذوقؔ و مومنؔ سے بہت دور رہا کرتے تھے
انتخابات میں گرمی نہیں آئی تھی ابھی
ورنہ وہ بھی کسی حلقے سے کھڑے ہو جاتے
پھر بھی جب اِن کے مقابل ہوئے دلی والے
شدتِ غیض میں گھبرا کے انہوں نے یہ کہا
دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا
حضرتِ ذوقؔ کی جانب سے ملا اِن کو جواب
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا
کشمکش دونوں کی جاری تھی باندازِ جنوں
دفعتاً شاہ ظفرؔ ذوقؔ سے فرمانے لگے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جاؤ گے۔
پھر مخاطب ہوئے غالبؔ سے کہ اے برخوردار

امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا"

یہ تخاطب ابھی جاری تھا کہ مومن آئے
منہ میں ایک پان لئے ہاتھ میں دیوان لئے
ان کو دیکھا تو کہا شاہ ظفر نے ہنس کر
آج کل رونقِ اردو کے سپاہی تم ہو
انتخابات کا عالم ہے کھڑے ہو جاؤ
رائے دیں گے تمہیں دلی کے صغیر و کبیر
ہار جاؤ تو سمجھنا کہ یہی تھی تقدیر
اس پہ مومن نے بڑی شان سے شرما کے کہا
"آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے"
آج بھی ملک میں ہونے کو ہیں ہر سمت چناؤ
کوئی پیتا ہے گڑ مبہ کوئی کھاتا ہے پلاؤ
مگر افسوس نہ غالب ہیں، نہ مومن، نہ ظفر
ہستیٔ شاہدِ مطلق کی کمر ہے یہ عالم
کوئی کہتا ہے مجھے کاش ٹکٹ مل جائے
اور ٹکٹ جس کو ملا ہے، اسے حلقہ نہ ملا
انتخابات میں جو لوگ کھڑے ہوتے ہیں
اپنے چھوٹوں سے بہر حال بڑے ہوتے ہیں
پھر بھی دیتے ہیں جب ووٹ انہیں اہلِ وطن
ان کے نعرے سے لرز اٹھتے ہیں سب کوہ و دمن
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

جب کوئی بار کے شرمندہ و مقروض ہوا
بار سا آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۶۱ء

○

آج کل دنیا کا مستقبل سب سے زیادہ مشتبہ چیز بن گیا ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جنگ ہوگی اور ساری کائنات بھسم ہو کر رہ جائے گی کچھ حضرات کا خیال ہے کہ لڑائی کا کوئی امکان نہیں اور یہ کہ ؎

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

غرض کہ اختلافِ خیال کا وہ دھندلکا چھایا ہوا ہے کہ دنیا کے مستقبل کی نسبت یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایسے ماحول میں جب ہم نے شاعرِ سیاست سے سوال کیا کہ زمانہ آئندہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ تو انہوں نے ایک آزاد نظم سنائی جس کے لئے ہم اُن کے ممنون ہیں اور نظم کی لذت میں آپ کو بھی شریک کر لینا چاہتے ہیں۔ عنوان ہے :

آنے والا زمانہ

پہلے ہم لوگ کیا کرتے تھے حقہ تازہ
کہ ہمیں کشمکشِ شوق کا تھا اندازہ

پھر کسی شاعرِ بیدار نے ہم سے یہ کہا
اُٹھ کے خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں

اور اس مصرعہ پہ کیا خوب لگایا مصرعہ
نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

آج تم پوچھ رہے ہو مجھ سے
زندگی جائے گی کس منزل تک ؟

اور احوالِ جہاں کیا ہوگا ؟

کیا کہیں کیا نہ کہیں سخت پریشانی ہے

خیر بازار سے تھوڑا سا خمیرہ منگواؤ

تشنگی حد سے بڑھی جاتی ہے حقّہ پلواؤ ۔

زندگی وجد میں ہے بم کا دھماکہ سن کر

شیخ کہتا ہے کہ یہ بھی ہے حرام اے ساقی

دو حریفوں کی یہ تحکم ہے کہ اک قہرِ عظیم

عشق بیچارہ نہ ملا نہ حکیم

رند کہتے ہیں یہ ساقی سے مخاطب ہو کر

تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی

اور ساقی انھیں دیتا ہے جواب

زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے

عشق آزاد بھی ہے عشق گرفتار بھی ہے

عقلِ گمراہ سے تخریبِ جہاں ممکن ہے

عقل چاہے تو تباہی سے اماں ممکن ہے

کیا عجب ہے کہ زمینوں پہ برسنے لگیں بم

جلد رکھ دے کوئی حقّہ پہ چلم

کیا عجب ہے کہ کششِ ثقل ہی باقی نہ رہے!

رند مدہوش رہوں اور بزم میں ساقی نہ رہے

اس سے پہلے ہمیں درکار ہے کش حقّے کا!

زندگی صرف چلم بن کے رہی جاتی ہے!

آرزوئے جنگ کا غم بن کے رہی جاتی ہے

ہائے اِس عہد میں انسان کا دم گھٹتا ہے

"آہ اِس باغ میں کرتا ہے نفس کوتاہی"

سب کو خطرہ ہے کہ دم گھٹ کے نہ رہ جائے کہیں

لوگ مرجائیں گے بہہ جائیں گے

باپ بیٹے کو نہ پہچانے گا

اور بیٹا یہ کہے گا رو کر

کیا میرا باپ نہیں ہے کوئی ؟

اک شمع کی لپک ایک شرارے کی چمک

آندھیاں آئیں گی انسان کا میولا بن کر

شہر رہ جائیں گے دریا بن کر

دشت ہو جائیں گے دریا بن کر

ہم سے مت پوچھ کہ احوال جہاں کیا ہوگا

کیا یہاں ہوگا، وہاں کیا ہوگا

موت ہے اصل میں انجام حیات

اپنے ہاتھوں سے پلاتے ہیں اے اہل کمال

اور کس شان سے فرماتے ہیں

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۶۱ء

○

یہ کیونکر ممکن تھا کہ حیدرآباد کے تاریخی فتح میدان پر دو عظیم ٹیموں کے درمیان کرکٹ میچ ہو اور شاعر سیاست خاموش رہیں۔

کرکٹ کے بیان میں

نشاط افزا ہے دو ٹیموں میں اِک دن میچ ہو جانا
کسی کا جیت جانا اور کسی کا کیچ ہو جانا!

مبارک ہو وطن والو

مبارک ہو چمن والو

کہ آج اپنی زمیں پر گیند بلے کی نمائش ہے!
ہیں چوبے کے تصیدے اور چھکے کی ستائش ہے!
پُرانے شہر میں مجمع لگا ہے قدر دانوں کا
کہیں ہے مانگ سگریٹ کی۔ کہیں ہے شوق پانوں کا
ہجومِ عاشقاں سے مشتعل ہیں ریڈیو والے
ہوں جیسے قافیہ سے تنگ شاعر لکھنؤ والے
کوئی کہتا ہے دُرانی کے چھکے خوب ہوتے ہیں
چھلاوہ ہے کہ بجلی ہے!
فضا میں گیند بلے کی روانی دیکھتے جاؤ
پٹوڈی واقعی کپتان ہے فوجوں پہ بھاری ہے
سبک ہے اور دھنک ہے، حوصلہ ہے اور ضرب کاری ہے
مخالف ٹیم میں بھی دیکسٹر صاحب کا کیا کہنا
یہاں سب لوگ اِن کے کھیل کی تعریف کرتے ہیں
مگر دشوار ہے بھارت میں آکر مشتعل رہنا
اُدھر بیرنگٹن نے بھی بنایا ہے مقام اپنا
ملے وہ فیلڈ میں تو اِس سے کہہ دینا سلام اپنا

یہ ہے وہ میچ جس کی تہہ میں روحِ دوستی بھی ہے
پریسیڈنٹ الیون کے مقابل ایم سی سی ہے
غلام احمد کہاں ہیں ان کو اس ڈیرے میں بلواؤ
اگر مصروف ہوں اک بات ان سے پوچھ کر آؤ
کہ تم گوشہ نشیں کیوں ہو گئے ہو نامور ہو کر
دھڑکتا دل کہتا ہے وہ گذرے ہیں ادھر ہو کر
وہ دیکھو کتنی عمدہ گیند اک بولر نے پھینکی ہے
وہ جیٹ اٹھا وہ ایک دلکش پٹاخے کی صدا آئی
سنہری دھوپ میں ننھا سا اک تارا چمکتا ہے
وداعِ روزِ روشن ہے مگر شام غریباں کا
یہ تارا یا تو ساری وسعتوں کو پھاند جائے گا
پکار اٹھیں گے دل والے!
گذر جاہاں گذر جا حسن سے بھی بے خبر ہو کر
وگرنہ اک کھلاڑی اس کو بڑھ کر کیچ کر لے گا
گل عیش و طرب سے دامنِ امید بھر لے گا۔
یہ کرکٹ کا کھیل بھی، زندگی کا مدعا بھی ہے
کہ اس میں جیت بھی ہے ہار بھی ہے اور ڈرا بھی ہے
ارے یہ سامنے سے گیند آئی! دیکھنا بھی ہے!
کھلاڑی اس کے اکثر دار کے مجرم بھی ہوتے ہیں
فلک دیتا ہے جن کو عیش ان کو غم بھی ہوتے ہیں
چمکتا ہے بلندی پر کوئی شمس و قمر ہو کر

کسی کا زندگانی کا نام "میڈن اوور" ہو کر
چلو ہم اپنے گھر میں بیٹھ کر کامنٹری سن لیں
کہ یہ بھی کھیل کی تفصیل کا دلکش خلاصہ ہے
سلام اس پر سکھایا ہم کو کرکٹ کا چلن جس نے
سجا ڈالا، وکٹ اور گیند بلے کا صحن جس نے
مگر اب تک وہ انسان شاید مر چکا ہوگا
فنا کے بعد کوئی سنچری بھی کر چکا ہوگا؟
خدا اس کی لحد پر رحمتوں کی گیند برسائے
اور اس کی روح میدانوں میں رن کرتی چلی جائے
یہ ہے وہ کھیل جس نے ارتقا کا حوصلہ بخشا
جو انٹرنیشنل ہے ایک ایسا مشغلہ بخشا
اگر کرکٹ نہ ہوتی دل کو بہلانے کہاں جاتے
تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے

۱۸ نومبر ۱۹۶۱ء

○

آج کل ہمارے شہر میں شادیاں بہت ہو رہی ہیں، جدھر جائیے جلوس ہیں، باراتیں ہیں، جہیز کا سامان ہے، بینڈ باجہ ہے، پھولوں سے آراستہ موٹریں ہیں، دعوتوں کا اہتمام ہے غرضکہ ایک قیامتِ صغریٰ برپا ہے!

جب شاعرِ سیاست دعوتوں میں جاتے جاتے تھک گئے تو انہوں نے شہر سے باہر پہونچ کر اور ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر حسبِ عادت "آزاد نظم" سپردِ قلم فرمائی، جسے یہاں درج کیا جاتا ہے، عنوان ہے

شادی

لفظ شادی پہ نہ جا' اس کے معانی کو سمجھ
اس میں تکلیف بھی ہے آرام بھی ہے!
بیاہ شربت بھی ہے اور زہر بھرا جام بھی ہے
کوئی شادی کے لئے مرتا ہے!
کوئی شادی سے بہت ڈرتا ہے
میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ بصد شوق و جنوں
سربازار یہ کہتا تھا کہ اے اہلِ وطن
جب محلے میں کسی شخص کا ہوتا ہے نکاح
"حسرت آتی ہے کہ وہ شخص ہمیں کیوں نہ ہوئے"
اور اک دوسرے انسان نے کہا رو رو کر
جشن شادی ہو کہ جلوہ ہو کہ چوتھی کا ہجوم
"جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا"
دعوتوں کا ہے وہ ہنگامہ کہ اللہ غنی
کہیں لقمی، کہیں سالن، کہیں بریانی ہے
سارے احباب کی مہمانی ہے
میٹھی میٹھی ترے کوچے سے ہوا آتی ہے
قورمہ کھا کے جو لیں آپ نے ٹھنڈی سانسیں
"باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا"
کوئی کھائے گا یہ کلیجے یہ پراٹھے یہ کباب؟
ہے مکرر لب ساقی پہ صدا میرے بعد

دفعتاً شور اُٹھا، لیجئے بارات آئی
کہیں پیسوں کے لئے لڑتے ہیں رکشا والے
گونجتی ہے کہیں موٹر میں "پیپے" کی صدا
جس سے پھٹ جاتے ہیں کان!
"پی کہاں" کون سنے!
کون سنائے "سہرا"
جیسے ایک حشر چلا آیا ہو بارات کے ساتھ
کوئی پرسان نہیں مہمانوں کا
ہے بہت دیر سے گھر والوں کو قاضی کی تلاش
اور قاضی کہ لئے پھرتا ہے تدبیر معاش!
وہ کسی دوسری شادی میں مصروف بہ کار
اس کے رتبے کو جو سمجھا بھی تو رضواں سمجھا
اس کو جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا
سخت دشوار سہی منزلِ ایجاب و قبول
بہت آسان ہیں اس دور میں شادی کے اصول
اب نہ "گھوڑے" کی ضرورت ہے نہ جوڑے کی تلاش
دشتِ ظلمات میں گھوڑوں کا نشان ملتا ہے
قرض نے کر جو کیا کرتے ہیں شادی یار د!
وہ پہنتے ہیں کیوں شوق سے کھادی یار د
ان سے جب کہئے کہ اسراف ہے اک خوئے قبیح
بیچ میں حضرتِ اقبالؔ کو لے آتے ہیں

اور بڑی شان سے منہ پھاڑ کے فرماتے ہیں
فکرِ فرزانہ کرو محوِ غم دوش رہو
تم کو شادی کی ضرورت ہے تو خاموش رہو
ایک دن حضرتِ غالب نے کہا حالی سے
تم نے بیوہ کی مناجات بہت خوب لکھی
اور مسدس کا نہیں کوئی جواب
اس پہ حالی کو بہت طیش آیا
اور فرمایا کہ اے پیرِ خرد مندِ عقل
تجھ کو اصنافِ سخن سے تو کوئی کام نہیں
باندھو شہزادہ جواں بخت کے سر پہ سہرا

۷ / جنوری ۱۹۶۲ء

○

پتہ نہیں اشٹ گرہا کا اثر ہے یا کسی ذہنی انقلاب کا نتیجہ کہ اس مرتبہ شاعر سیاست نے آزاد کے بجائے پابند نظم سپردِ قلم فرمائی ہے، نظم کے متعلق فیصلہ تو قارئین کرام ہی فرمائیں گے، ہمیں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ انتخابات کے ہنگاموں میں اس نظم کا مطالعہ یقیناً مفید ثابت ہوگا۔ ہم نے شاعر سیاست سے خواہش کی ہے کہ وہ آئندہ بھی اس اہم اور نازک موضوع پر فکر فرماتے رہیں!

اب نظم ملاحظہ ہو، عنوان ہے:

"انتخاب"

پلا ساقیا بادۂ انتخاب
کہ جھلکا ہے آمادۂ انتخاب

ادھر اشٹ گرہا الکشن ادھر
دورا ہے پہ بھٹکی ہوئی ہے نظر

تیادت کے بازار سجنے لگے
نئی تال پر ڈھول بجنے لگے

جسے دیکھیے ہے وہ امیدوار — کسی کو ہے کھانسی کسی کو بخار

کوئی کہہ رہا ہے کہ لے بھائیو — مجھی کو فقط ووٹ دلوائیو

یہ مانا کہ احمق بھی جاہل بھی ہوں — مگر میں قیادت کے قابل بھی ہوں

کبھی قوم کی میں نے خدمت نہ کی — جو بے بس تھے ان سے مروت نہ کی

سدا میں امیروں سے ملتا رہا — یونہی غنچہ عمر کھلتا رہا

غریبوں کو میں نے ستایا بہت — رئیسوں کے میں کام آیا بہت

مگر اب تو ہوں صرف امیدوار — مری جیت کا آپ پر ہے مدار

کسی کی زباں پہ یہ تقریر ہے — کہ اب لیڈری میری جاگیر ہے

ادھر آؤ تم کو تہاری کھلاؤں — ہر اک شخص کو باری باری کھلاؤں

مگر شرط یہ ہے کہ میرے جنو — اجالوں سے نکلوا اندھیرے جنو

ملے شیخ کو اور نہ خاں کو ملے — ہر اک ووٹ میرے میاں کو ملے

کریما ببخشائے بر حال ما — کہیں سے مجھے، اور پیسے دلا

الٰہی یہ کیا مجھ پہ ادبار ہے — کہ فرزندت سے بیکار ہے

گراں خواب لیڈر سنبھلنے لگے — جو بیدار تھے ہاتھ ملنے لگے

کہ ہے ہے یہ جنتا کو کیا ہو گیا — ہر انسان اپنا خدا ہو گیا

نہیں مانتا کوئی لیڈر کی بات — معزز ہو کوئی کہ ہو نیچ ذات

سنائیں کسے جا کے اب درد دل — کہ ہم عارضی، زندگی مستقل

جو بیٹھے ہوئے تھے کھڑے ہو گئے — کھڑے ہو کے سمجھے بڑے ہو گئے

مزے میں ہیں نہ جو وہیں لیٹے ہوئے — نہ جانے انھیں کتنے بیٹے ہوئے

غرض یہ کہ گانے کے دن آ گئے — الکشن لڑانے کے دن آ گئے

الٰہی تو رکھ دیش میں امن و اماں کہ ہے سخت مشکل میں ہندستان
وطن کو مرے عقل درکار ہے تمہارا نام ستار و غفار ہے

۶ رفروری ۱۹۶۲ء

○

چار سو مرادو بیمار شعراء کی امداد کیلئے کل اردو ہال میں جو مشاعرہ ہوا، اس میں شاعر سیاست شریک نہیں تھے، ہم نے جب وجہ پوچھی تو نہایت رقت انگیز انداز میں فرمایا کہ یہ مشاعرہ صرف غزل سرائی تک محدود تھا اور میں آزاد نظم لکھتا ہوں، ظاہر ہے کہ ہم لاجواب ہو گئے، لیکن موصوف نے ہماری لاجوابی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے جیب سے ایک نظم نکالی اور ہمارے سامنے ڈال دی، یہ نظم اس لحاظ سے خصوصیت رکھتی ہے کہ اس میں مصرعہ طرح کی رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی ہے اور آزاد نظم کی شان بھی باقی ہے! ملاحظہ ہو عنوان ہے:

شادیوں کا ہنگامہ

ہو رہی ہیں بہت شادیاں دوستو
آج جائیں تو جائیں کہاں دوستو
کل تلک ایک شخص مرغ آزاد تھا
آج پنجرے میں ہے پرفشاں دوستو

اس طرف شادیاں
اُس طرف شادیاں

ایک سہرا گلے میں سجائے ہوئے
کیا اکڑتے ہیں دولہامیاں دوستو
ایک شادی کی محفل میں پہونچے جو ہم
دیکھتے کیا ہیں ابحد رنج و الم

کوئی صاحب مشجر میں لپٹے ہوئے
کہہ رہے تھے بصد یاس و رنج و محن
میرا ملبوس ہے آرزو کا کفن
اپنی شادی پہ ہوں نوحہ خواں دوستو
قرض لے کے نکالا جو ارمانِ دل
زیست ہے ایک بارِ گراں دوستو
تم نے شادی نہ کی
تم مزے میں رہے
ہم مصیبت میں ہیں اور پریشان ہیں!
روز ہے فکر سود و زیاں دوستو
قیس اچھا رہا اس نے شادی نہ کی
قبل شادی اسے موت نے کھا لیا
اور اسی طرح فرہاد بھی
مار کر سر سے تیشہ روانہ ہوا
ایک ہم ہیں جو شادی کی زنجیر میں
خوب باندھے گئے
خوب رسوا ہوئے
پھر بھی زندہ ہیں ہم
لب پہ مصرعہ یہ ہے
زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی
وہ لڑی آج ثابت کہاں دوستو

۱۲ر مئی ۱۹۶۲ء

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ شاعریت زیادہ حساس ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمارے شاعر سیاست جب موجودہ گرمی زیادہ برداشت نہ کر سکے تو انھوں نے پنکھے کے نیچے بیٹھ کر ایک مختصر سی آزاد نظم کہہ دی ان کا خیال ہے کہ جو حضرات اس نظم کو دن میں ایک دو دفعہ پڑھیں گے۔ انھیں گرمی بہت کم محسوس ہوگی۔ ملاحظہ فرمائیے عنوان ہے:

گرمی اور وغیرہ!

ہم نشیں موسم گرما کے مصائب مت پوچھ

آہ کرتے ہیں تو دوزخ کی ہوا آتی ہے!

کس جگہ جائیں کہاں بیٹھ کے فریاد کریں

اب تو جو چیز ہے وہ آگ بنی جاتی ہے!

کوئی لسی میں مگن ہے کوئی فالودے میں

اور کہیں آب خنک

باعثِ فرحتِ اربابِ دل و جاں ٹھہرا

ایسے موسم میں ہے لوگوں کو وغیرہ کی تلاش

ہمت مل جائے کہیں سے تو بڑا کام چلے

باہر آ جاتی ہیں کتوں کی زبانیں منہ سے

اور انسان یہ کہتا ہے زباں داں ہوں میں

ہے پسینہ کا یہ عالم کہ الٰہی توبہ!

نل میں پانی نہیں اور غسل کئے بیٹھے ہیں

صاحبِ خیر لگاتے ہیں سبیلیں لیکن

ان میں جو شخص متعین ہے وہ سو جاتا ہے

آسماں آگ، زمیں آگ، مکانات بھی آگ
عشق بھی آگ ہے اور عشق کے جذبات بھی آگ
روح کو فکر کہ شربت بن جائے
جسم بیچارہ پسینے کی روانی مانگے
شہر میں بھیڑ سی ہے، اہلِ طلب کی ہر سمت
جس کو کھانے پہ بلاؤ وہی پانی مانگے!
سوچتے رہتے ہیں گرمی سے پریشاں ہو کر
کبھی اوٹی کبھی کشمیر نگر جائیں گے
اور اسی فکر میں آتی ہے یہ دل سے آواز
واں بھی گر چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

۲۷ مئی ۱۹۶۲ء

○

آم اور غالب

آموں کا موسم شباب پر ہے اور ہمیں بے اختیار مرحوم غالب یاد آ رہے ہیں جو عین بڑھاپے کے عالم میں انتقال فرما گئے، مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ موصوف کو آم بے حد پسند تھے، اور جب کسی محفل میں آموں کے موضوع پر بات چیت ہوتی تھی تو آپ کے منہ میں پانی بھر آتا تھا، جسے آپ اگالدان میں تھوک دیتے تھے اور بصد حسرت یاس وہ مطلع موزوں کرنے میں مصروف ہو جاتے ؎

آم سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا

آم سے غالب کی شگفتگی اور شگفتگی اتنی بڑھ گئی تھی کہ کبھی اُس شخص سے مناظرہ کرنے پر تیار نہ ہو جاتے تھے جو آموں کا مخالف ہو، چنانچہ جب ایک

دوست نے طنز اور اعتراض کے لہجہ میں آپ پر یہ انکشاف کیا کہ گدھا آم نہیں کھاتا تو آپ نے فی البدیہ فرمایا کہ "جی ہاں گدھے آم نہیں کھاتے" ظاہر ہے کہ معترض اپنا سا منہ لے کر رہ گیا، بعض محققین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ غالب کو چند دن کے لئے جیل کی سزا ملی تھی، اس کے پیچھے بھی آموں کا شوق کام کر رہا تھا۔ شاعر اپنے محبوب کو ہمیشہ موضوع سخن بناتا ہے چنانچہ غالب مغفور نے بھی آم پر ایک نظم سپرد قلم فرمائی ہے شروع کے بول ہیں،

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے

آپ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے، چنانچہ ملاحظہ فرمایئے کہ جسطرح غالب کو آموں کا بہت زیادہ شوق تھا اسی طرح شاعر سیاست بھی آم کے موسم میں آم کھائے بغیر نہیں رہ سکتے صرف یہی نہیں بلکہ آج جب آپ دفتر تشریف لائے تو آموں کی ٹوکری میں ایک نظم بھی رکھی ہوئی تھی، ہم نہیں چاہتے کہ آپ اس کی لذت سے محروم رہیں اس لئے ملاحظہ ہو۔

رکھ کے ایک آم کفِ دست پہ غالب نے کہا\
زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہیئے۔\
نہ ملے بادۂ انگور تو کچھ فکر نہیں\
آم تقدیر سے مل جائیں تو پھر کیا کہیئے\
یہی اپنا بھی عقیدہ ہے بقولِ غالب\
سخت بدبخت ہے جو معتقدِ آم نہیں\
آم ہے میوۂ فردوس\
نشانِ جنت

آم سے ہوتی ہے افزائشِ خون!

آم کھاتے تھے بہت شوق سے لیلیٰ مجنوں!

آم کے فیض سے نام ان کے ابھی زندہ ہیں!

صفحۂ دہر پہ تابندہ ہیں!

اپنی روداد کو تاریخ جو دہراتی ہے

آم کھاتا ہوں تو آواز بدل جاتی ہے

شام کے وقت مرے خواب میں آم آتے تھے

یاد آیا مجھے آموں کا مزہ آخر شب

رس گوارا ہے مجھے آم کی گٹھلی نہ سہی

غیب سے آتے ہیں آموں کے مضامین اکثر

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

آم کے جھاڑ پہ غالب کی نظر تھی اک دن

دیکھتے دیکھتے اک بار ظفر سے بولے

شام کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

قبرِ غالب پہ جو اک دن میں سرِ شام گیا

سارے ماحول میں آموں کی بسی تھی خوشبو

قبر سے کان لگایا تو یہ محسوس ہوا۔

اک غمناک سی آواز چلی آتی ہے

روحِ غالب نے کہا مجھ سے کہ اے سوختہ جاں

تجھ کو معلوم ہے کیا حال رہا میرے بعد

آم کھانے سے جو اس کو کبھی فرصت نہ ملی

حسن و غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

۱۰ جون ۱۹۶۲ء

یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ ایک پرانی کہاوت کے مطابق بگڑا شاعر مرثیہ گو ہوتا ہے یا نہیں، لیکن جہاں تک ہمارے تجربے کا سوال ہے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ آج کل کی بگڑے ہوئے نثر نگار محقق بن جاتے ہیں اور اتنے زور و شور سے دادِ تحقیق دیتے ہیں کہ بسا اوقات کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی! ایسا یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تحقیق کا کوئی نقارہ ہے جس پر مسلسل چوب پڑ رہی ہے۔

محقق بن جانا شہرت حاصل کرنے کا بہت آسان ذریعہ ہے علم و ادب کے کسی شعبے میں کوئی نیا انکشاف کر ڈالیے آپ کا نام چار دانگ عالم میں پھیل جائے گا اور کوئی آپ سے اتنا بھی نہیں پوچھے گا کہ آپ کا املا درست ہے یا نہیں اور یہ کہ آپ کے منہ میں دانتوں کی تعداد کیا ہے۔ فنِ تحقیق کی مختلف قسمیں ہیں، ایک تو یہ کہ محقق کوئی ایسی بات کہہ ڈالے جو نہ آنکھوں سے دیکھی گئی ہو اور نہ کانوں سے سنی گئی ہو، مثال کے طور پر اگر تاریخ آپ کی لائن ہے تو کسی دن یوں اظہارِ خیال فرما ڈالیے۔ دہلی کا قطب مینار سلطان محمد غزنوی نے اپنے جوان سال لڑکے کی یاد میں تعمیر کروایا تھا جس کا نام قطب الدین تھا اور جو مینار تخلص رکھتا تھا لوگ حیرت زدہ رہ جائیں گے اور سر دھنیں گے۔ محقق کی دوسری قسم وہ ہے جس کیلئے کسی تحقیق کی ضرورت نہیں۔ مثلاً آپ لکھ دیجئے کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں ڈوب جاتا ہے پڑھنے والے آپ کی صداقت بیانی کے قائل ہو جائیں گے یا یوں ارشاد فرمایئے کہ حیدرآباد کے حالات ۱۹۵۰ء کے بعد بتدریج تبدیل ہوتے گئے ہیں یا جرأت کر کے لکھ دیجئے کہ محمد تغلق پیدا ہونے کے بعد مسلسل بڑھتا رہا، یا انکشاف کر ڈالیے کہ ایک ننھا سا پودا آہستہ آہستہ تناور درخت بن گیا، ایسی حرکتوں سے آپ ایک نہ ایک دن محقق کہلائیں گے۔ اس موقعہ پر بیجا نہ ہوگا اگر ہم آپ کی خدمت میں شاعر سیاست کی وہ نظم پیش کر دیں۔ جس کا عنوان ہے۔

محقق

ہم محقق ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
جو کتابیں تھیں وہ نذرِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
جس جگہ بہتی ہے اب موسیٰ ندی
اس جگہ کل تک کھڑا تھا ایک پہاڑ
زلزلہ سے ریزہ ریزہ ہو گیا!
امتیاز اک شاعرہ تھی توز اک قوال تھے
اور مومن دیتے پھرتے تھے مساجد میں اذان
رہتے تھے جعفر زٹلی کے چچا تاندور میں
اور وہ خود رستم پنجاب کا شاگرد تھا!
ایک دن ہٹلر نے خوش ہو کر ہمایوں سے کہا
میں تیرا مدفن بناؤں گا الہ باد میں
ہجو خود اپنی لکھی سودا نے جب مرنے لگا
حضرت ضاحک پریشاں ہو گئے
فیض اک شاعر دکن کے تھے مرے دو مرتبہ
لوگ کہتے ہیں کہ یہ تھا ان کا اعجازِ سخن
ہے جو اک چھوٹا سا دلکش گاؤں سورت کے قریب
اس جگہ غالب کا حقہ آج تک محفوظ ہے۔
ایک صاحب نے تصوف پڑھ دیا
اور جنوبِ ہنت نامی ایک رسالہ لکھ دیا

کیا بتائیں کون تھے کیسے تھے مسٹر سور داس
اور میاں جرأت کی نسبت بھی علیٰ ہٰذا القیاس
ہم محقق ہیں ہمیں پروا نہیں
ماردیں ہم جس کو چاہیں جس کو چاہیں چھوڑ دیں
جو ہمارے سامنے آئے سر اس کا توڑ دیں۔

۱۷ جون ۱۹۶۲ء

○

سڑک پر

ایک سڑک چھاپ جو فرہاد بھی تھا غنڈہ بھی
اس کو شیریں سے تعلق تھا نہ خسرو سے غرض
اپنی ہی دھن میں سرِ راہ چلا جاتا تھا
مار کر آنکھ بڑی شان سے فرماتا تھا
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے
مجھ کو یہ غم ہے کہ اِس دورِ زبوں حالی میں
نوجوانانِ وطن آہ کہاں تک پہونچے
نہ کوئی کام نہ دھندا نہ مدرسہ نہ سبق
عمر ان لوگوں کی کٹ جاتی ہے بیکاری میں
گھر پہونچتے ہیں تو رہتا ہے یہ دھڑکا ان کو
گر یہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
کبھی ہوٹل میں گھسے چائے کی پیالی پی لی
کبھی سسٹر کوں پہ کھنڈے سے ہو کے کسے آوازے

کبھی رکشا کا تعاقب کبھی موٹر کی تلاش
نہ انھیں پاسِ محبت نہ انھیں فکرِ معاش
ان کے والد نہیں
بھائی نہیں
اولاد نہیں
ان کو منظورِ نکو نامیِ فرہاد نہیں
قرض لیتے ہیں تو واپس نہیں کرتے ہرگز
بلکہ لڑتے ہیں
جھگڑتے ہیں
خفا ہوتے ہیں
کاش قانون بنے کوئی کہ جس کے باعث
گھر سے باہر یہ لفنگے نہ نکلنے پائیں
سلسلہ ان کا کبھی ختم نہیں ہوتا ہے
ایک مرتا ہے تو دس اس کی جگہ لیتے ہیں
یعنی فرہاد کے مدفن سے یہ آتی ہے صدا
آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد

۸ رجولائی ۱۹۶۲ء

○

کسی مفکر نے کہا ہے کہ اگر انسان کو موت نہ آئے تو وہ کنویں میں کود کر یا پہاڑ سے نیچے گر کر خودکشی کرنا شروع کر دے۔ اس قول میں بڑی صداقت معلوم ہوتی ہے اور اگر حالات پر غیر جانبدارانہ نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس انسان کو جسے عرفِ عام میں اشرف المخلوقات کہتے ہیں زندگی سے زیادہ موت پیاری ہے۔ اور وہ سہرہ باندھنے کے

مقابلے میں کفن پہننے کو ترجیح دیتا ہے۔

زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں صرف اِس صورت حال پر ایک نظر ڈال لیجیے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان پر جوہری توانائی کا راز منکشف کیا' بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا (CREDIT) سائنس دانوں کو جاتا ہے' اور اس نے اس توانائی سے بم بناڈالے تاکہ وہ کسی مناسب موقعہ پر عالمگیر ہلاکت کے لیے استعمال کیے جائیں اور صفحہ دنیا سے انسانیت کا نام و نشان مٹا کر رکھ دیا جائے !

اس سلسلہ کا یہ واقعہ صفحہ تاریخ پر خونیں حروف سے لکھا جائے گا کہ ایک طرف تو دنیا کے ایک حصہ میں امن عالم کو باقی رکھنے کے موضوع پر بات چیت ہو رہی تھی دوسری طرف فضا میں ایک ایسا بم تجربتاً چھوڑا گیا جس کی روشنی دور دور تک پہونچی اور جس کے مضر اثرات خدا جانے کب تک کام کرتے رہیں گے گویا ایک ایسی ذہنیت بھی موجود ہے جو امن کی گفتگو کو پسند نہیں کرتی اور اس کی آواز کو بم کے شور میں دفن کر دینا چاہتی ہے۔ ان حالات میں یہ کس طرح ممکن تھا کہ شاعر سیاست کسی گوشے میں بیٹھے ہوئے چلے پیتے رہتے اور تجرباتی دھماکوں سے کوئی اثر قبول نہ کرتے' چنانچہ انہوں نے حسب معمول ایک آزاد ڈائپ کی نظم سپرد قلم کرنے کے بعد ہمارے سپرد کر دی ہے جسے ہم حسب قاعدہ آپ حضرات کے سپرد کرتے ہیں عنوان ہے:۔

حُسن اور دھماکہ

زندگی حسن بھی ہے دھماکہ بھی ہے
زندگی شہد بھی ہے پٹاخہ بھی ہے
زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی' زندگی سکراتی ہوئی پھلجھڑی
بزم کوئی بھی ہو ساز کوئی بھی ہو
زندگی روئے گی زندگی گائے گی

حسن شرمائے گا حسن للچائے گا
زندگی اک دھواں بن کے اُڑ جائے گی
آدمی سے کہا ہے یہ اللہ نے
خوب کھاؤ پیو اور مزے سے جیو
پھر اسے عقل کے ساتھ قوت بھی دی
تاکہ وہ راستوں پر سنبھل کر چلے
لیکن اک شخص نے اُٹھ کے یہ دعویٰ کیا
آدمی کی رگوں میں ہے بندر کا خون
اس لئے اس کے دل میں تمنا ہے یہ
رُخ بدل کر چلے اور اُچھل کر چلے
آدمی کا اُچھلنا بڑی چیز ہے
اور فضا میں مچلنا بڑی چیز ہے
اک طرف امن کی بات چلتی رہی
دوسری سمت بم پھٹ کے سر پر گرا
آگ، شعلہ، حرارت، چمک، روشنی
جو پرندے فضا میں تھے سب جل گئے
آرہی ہے ہوا میں کبابوں کی بو
کل سکندر نے پورس پہ حملہ کیا
خوب کھیلی لڑائی تو میں کیا کروں
مجھ کو اِس بات کا غم ہے دس روز سے
جوہری تجربے رنگ کیا لائیں گے

حسن اور عشق والے کہاں جائیں گے
عورتیں جن کو بیٹی کی آواز سے
ہول آتا ہے بے انتہا بھائیو
جوہری بم کا شور اجل آفریں
کس طرح سن سکیں گی بھلا بھائیو
اور ننھے کھلاڑی کہاں جائیں گے
گیند بلا کہاں، گلی ڈنڈا کہاں
مرغ و ماہی کہاں اور انڈا کہاں
حسن پھولوں کا مرجھا کے رہ جائے گا
اور لوہا لہو بن کے بہہ جائے گا
یہ دھماکے نہیں موت کا راگ ہیں
آگ ہیں، آگ ہیں، آگ ہیں، آگ ہیں
آؤ روکیں انھیں آؤ ٹوکیں انھیں
بڑھ نہ جائیں کہیں دوریاں دوستو
پس نہ جائیں کہیں ہڈیاں دوستو

۱۵ جولائی ۱۹۶۲ء

○

شاعرِ سیاست کا خیال ہے کہ آج کل ملک میں رشوت خوری کی وبا بڑی خطرناک ہو گئی ہے۔ جب ہم نے اِن سے اختلاف کرنا چاہا تو انہوں نے ایک نظم ہماری طرف اُچھال دی جسے ہم اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، اور فیصلہ انہی پر چھوڑتے ہیں!

رشوت

کتنے رشوت خور خدمت سے معطل ہیں مگر
کیسی کیسی رشوتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

کہہ رہا تھا کل سرِ بازار اک اہلِ غرض
گرم بازاری ہے رشوت کی زمیں تا آسماں

کس طرف جاؤں
کدھر دیکھوں
کسے آواز دوں

ہوں بہ فیضِ مفلسی دس سال سے بے روزگار
اور رشوت مانگتے ہیں صاحبانِ اقتدار

واقعہ یہ ہے کہ میری جیب میں پائی نہیں
اسلئے تصویرِ جاناں میں نے کھنچوائی نہیں

آپ ہی فرمائیے رشوت کہاں سے لاکے دوں
اور اگر رشوت نہ دوں تو گھر میں بیٹھوں چپ رہوں

گھر کا یہ عالم ہے بارش میں کہ جیسے کوئی جھیل
اک طرف گنگ و جمن ہیں، اک طرف دریائے نیل

گھر کے مالک نے لکھا ہے خط کہ ہم مجبور ہیں
آپ کے خورد و کلاں کی خیریت مطلوب ہے
اور یہاں فوراً کرایہ بھیجئے
ورنہ کوئی دوسرا گھر دیکھئے۔

جب کرایہ مانگنے آئے گا کوئی اہلِ ذوق

اس کو رشوت دے کے لوٹا دوں گا میں
اور وہ اس پیسے سے دیکھے گا کوئی اچھا فلم
رشوت اک ایسی چیز ہے جس سے بچ جاتی ہے جان
رشوت اک ایسی ادا ہے جس سے چھپ جاتا ہے جسم
مسکرانا ہے تو رشوت دیجئے
گنگنانا ہے تو رشوت دیجئے
گھر بسانا ہو تو رشوت دیجئے
رات بھر گانا بجانا ہو تو رشوت دیجئے
آپ رشوت دیں تو حق باطل بنے
اور باطل حق کی مونچھیں نوچ لے
جب مریضوں سے بھی رشوت مانگتا ہے کوئی شخص
اپنے بستر پر بدل کر کروٹیں کہتے ہیں وہ
مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے
کہہ چکے ہیں اپنے اک دیوان میں استاد شاد
ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بہت رشوت کا زور
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر
صاحبان زر رشوت دے کے جو چاہیں کریں
اور غریب اپنی جگہ لیٹے ہوئے آہیں کریں
کب تمنا کی کلی کھلتی ہے رشوت کے بغیر
قبر کی جا بھی نہیں ملتی ہے رشوت کے بغیر
اس طریقے کو فرشتوں تک بھی پہونچائیں گے ہم
دے کے کچھ رشوت سوئے جنت چلے جائیں گے ہم

۲۲ جولائی ۱۹۶۲ء

○

شاعرِ سیاست نے اپنے مخصوص انداز میں قومی یکجہتی پر ایک نظم آپ کی خدمت میں پیش کی ہے۔

قومی یکجہتی

محبت کی نظر میں ایک ہے ہندوستان اپنا
سیاست نے مگر اس کے کئی حلقے بنائے ہیں
عجب عالم ہوا ہے بعد آزادی
وہ پتے جن پر تکیہ تھا
ہوا دیتے ہیں شعلوں کو
بنائی جا رہی ہیں مسجدیں ڈیڑھ اینٹ کی ہر سو
ہر اک اپنے شوالے کو سمجھتا ہے جہاں اپنا
کبھی پنجاب والے ایک تازہ گل کھلاتے ہیں
کبھی گجرات سے آواز آتی ہے ابے سن بے
ادھر بنگال بس اپنے رشوگلو پہ نازاں ہے
ادھر یو پی میں ہے پوری کچوری بھی نہاری بھی
کوئی مدراس کی ہوٹل میں دو شا کھا کے کہتا ہے
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
سنا ہے ایک مسلم لیگ اس نے کھول رکھی ہے
شرابِ تلخ میں تھوڑی شکر بھی گھول رکھی ہے
ادھر ہے آندھرا اور اُدھر میسور بیٹھا ہے

بہت نزدیک ہے لیکن نہایت دور بیٹھا ہے
اُڑیسہ کو اگر سیلاب سے فرصت نہیں ملتی
تو راجستھان والے دوسروں پہ خاک اڑاتے ہیں
کیرالا انقلابیوں کا وطن ہے
صبح مشرق ہے

اور اک صوبہ ہے، اپنا مدھیہ پردیش اسکو کہتے ہیں!
یہاں کچھ عورتیں رہتی ہیں اور کچھ مرد رہتے ہیں
یہی کہتا ہوا باشندہ آسام ملتا ہے
تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا آرام ملتا ہے
بہار اک انجمن ہے جس میں اہل ذوق رہتے ہیں
یہ اپنے کان سے سنتے ہیں اپنے منہ سے کہتے ہیں
مگر کشمیر کے پھولوں کی بو سب سے نرالی ہے
یہاں جو شخصیت ہے خوب ہے اللہ والی ہے
کہیں رونق نہیں اور کسی جا "گوشتابہ" ہے
امیروں کے مزے ہیں اور غریبوں کا خرابہ ہے
غرض اے بھائیو اے دوستو اے کھوپڑی والو
مری باتیں توجہ سے سنو اب ان کو مت ٹالو
ہمارا ملک ہے ایک اور اسٹیٹ اس کے اجزا ہیں
ہمارا ملک ہے جسم اور پردیش اس کے اعضا ہیں
زباں کی کشمکش کیا
اور تہذیبوں کی ٹکر کیا

تصوف کی نظر سے دیکھنے کا "کشت" فرماؤ
من و تو کے اندھیروں سے ذرا باہر نکل آؤ
نہ پنجابی رہے باقی، نہ آسامی، نہ بنگالی
مزا جب ہے کہ ہر انسان مل کر گائے قوالی
اور اس کے بول اگر یہ ہوں تو اچھا ہے
اہے وا، مصرعہ شاعر میں بھی کتنے معانی ہیں
کہیں رہتے ہوں ہم سب ایک ہیں ہندوستانی ہیں
وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے
جسے سب شوق سے سن لیں تو بیڑا پار ہو جائے
بہار آئی ہوئی ہے کم سے کم اتنا تو ہو یارب
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

متفرق نظمیں

O

یہ ایک بالکل آزاد نظم ہے ؎

زندگی جام بھی ہے اے دوست
میں نے چاہا تھا کہ جا کر کسی میخانے میں
مئے پیوں
خوب جیوں
نظم مکمل کر لوں
باپ کے خوف سے لیکن میری ہمت نہ ہوئی
آہ یہ درد یہ غم
اب کہاں جاؤں کہ راہوں میں جوانانِ پولیس
روک سکتے ہیں مجھے
ٹوک بھی سکتے ہیں مجھے
میں ہوں ایک شاعرِ افسردہ و آوارہ مزاج
قرض جس شخص سے مانگوں وہ ستاتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

○

حضرت سراج اورنگ آبادی کی زمین میں معذرت کے ساتھ ؎

لگا سر پر تیرے دربان کا پھینکا ہوا پتھر
چلی جاتی اگر اک آنکھ ہم کانے ہوئے ہوتے

مطب سے بھیجتے رہتے ہیں لکھ لکھ کر نئے نسخے
اطبا دیکھتے مجھ کو تو دیوانے ہوئے ہوتے

لکھا ہے صرف خشکہ اور رکھا اپنی قیمت میں
اڑاتے قورمہ ہم بھی جو فرزانے ہوئے ہوتے

کہاں تک تربتیں لیں کس کو منائیں کس کو سمجھائیں
جو اپنے ہیں وہی اے کاش بیگانے ہوئے ہوتے

۲۲ دسمبر ۱۹۵۹ء

صرف دو شعر عرض ہیں ؎

کسے معلوم تھا اک روز جلوہ گری ہوگی
کہ وہ کھڑکی میں ہونگے اور دنیا دیکھتی ہوگی

وہ بزم شعر و موسیقی سے دلچسپی نہیں رکھتے
کسی آرام کرسی پر انھیں نیند آ گئی ہوگی

۲۳ دسمبر ۱۹۵۹ء

○

کانپور ٹیسٹ

فتح نامہ کرکٹ بطرز مثنوی سحرالبیان

وہ آئے تھے خوشیاں مناتے ہوئے
جہازوں میں سیٹی بجاتے ہوئے

بہت شاد تھے اور مغرور تھے
کبھی تو کسی نشے میں چور تھے
رہی ایک مدت تلک اُن کی جیت
وہ گاتے رہے کامیابی کے گیت
وکٹ کو ہوا میں تھماتے رہے
مسلسل ہتھیلی کھجاتے رہے
اکڑتے رہے اور مچلتے رہے
سنورتے رہے اور سنبھلتے رہے
ہواؤں سے لڑتے جھگڑتے رہے
کبھی داد کا شور سنتے رہے
کبھی فتح کے پھول چنتے رہے
مگر پھر مقدر نے کروٹ جو لی
تو ساری اکڑفوں دھری رہ گئی
دکھایا عجب ہندیوں نے کمال
ہوا بد سے بدتر حریفوں کا حال
وکٹ پر وکٹ جب گرنے لگے
تو منہ پہلوانوں کے پھرنے لگے
جب آیا مقابلہ میں جشو پٹیل
تو یہ حال تھا میدان میں سیل
بڑے رستموں کو رہا لے گئے
بھتیجوں کو جیسے چچا لے گئے

کھلاڑی الٹا کر سپٹنے لگے
جو تھے شیر میداں سے ہٹنے لگے
فقط ایک سو پانچ رن بن سکے
سو وہ بھی بصد سعی و فن بن سکے
مبارک تھا ہنگامۂ کانپور
کہو آج ہے اس کو دار سرور
الٰہی تو ستار و غفار ہے
ہمارا تجھ سے یہی اصرار ہے
کہ رکھ کامراں ہند کی ٹیم کو
یہ جیتے سدا ہفت اقلیم کو
کھلاڑی سب اس کے توانا رہیں
زمانے کی ٹیموں میں یکتا رہیں
خدایا تو ہنگامہ کر اب اناج
یہی ہر کھلاڑی کا ہے احتیاج
نہ رونے کے ہیں نہ گانے کے ہیں
یہ دن کھیلنے اور کھانے کے ہیں

○

ایک مصرعِ طرح ہے ۔
"حُسن نے جب شکست کھائی ہے"

اِس پر شاعرِ سیاست نے کہا :

بس یہی راز نارسائی ہے — درِ جاناں پہ اس کا بھائی ہے
غور سے دیکھ شیخ کی عینک — یہ خریدی نہیں چرائی ہے
جو رقم میری جیب میں آجائے — میرا حق ہے میری کمائی ہے
جال ڈالا ہے میں نے دریا میں — کسی مچھلی کی موت آئی ہے
میری چوری کھلے گی اب کیونکر — یعنی ہر چور میرا بھائی ہے

۲۶ دسمبر ۱۹۵۹ء

○

گورکن سے فیض سے کچھ کچھ نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

باغباں سیٹی بجا کر گلستاں میں سو گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہوگئیں

ہوں دعا گو پھر بھی میرا حافظہ کمزور ہے
یاد تھیں جتنی دعائیں حرفِ درباں ہوگئیں

فیملی پر گر پلاننگ کا اثر پڑتا رہا
دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

۲۹ دسمبر ۱۹۵۹ء

○

مصرعِ طرح ہے

"کوئی منزل ہو مگر گذرا چلا جاتا ہوں میں"

ان کے کوچے میں مسلسل ٹھوکریں کھاتا ہوں میں
اور جب ملتا ہے موقع چھت پہ چڑھ جاتا ہوں میں
میری فطرت پر نظر رکھ میرے ظاہر پر نہ جا
وہ نہیں ہوں اصل میں' جو کچھ نظر آتا ہوں میں
یا خدا کیوں مجھ میں رکھ دی ہے یہ خوئے شیطنت
جب کہ دنیا میں "خلیفہ" تیرا کہلاتا ہوں میں
جیب ہو جاتی ہے جس دن گرم گاتا ہوں ملہار
اور جب پیسے نہیں ملتے تو جھنجھلاتا ہوں میں
میری موسیقی کو یہ دنیا سمجھ سکتی نہیں
یعنی دیپک کے سُروں میں بھیرویں گاتا ہوں میں

○

واپس آنا گرمی کا

شہر کا اب یہ حال ہے بھائی
جیسے گرمی کی رت پلٹ آئی

سب پسینے میں نہائے ہوئے
شدتِ غم سے منہ بنائے ہوئے

آسماں گرم ہے زمیں بھی گرم
جیب بھی گرم، آستیں بھی گرم

گرم کرتا ہے شیروانی گرم
کارگہ گرم، جامہ دانی گرم

گرم ہے میز اور کرسی گرم
دوستوں کی مزاج پرسی گرم

خاموشی گرم اور باتیں گرم
دن بھی ہیں گرم اور راتیں گرم

گرم پانی ہے گرم کھانا ہے
دوستو یہ بھی کیا زمانہ ہے

ہو چکا ہے شروع اکتوبر
پھر بھی گرمی سے حال ہے ابتر

کہیں ٹھنڈی ہوا نہیں چلتی
وہ نسیم و صبا نہیں چلتی

حبس رہتا ہے صبح تا شام
سانس لینا بھی اب ہے مشکل کام

آسماں ہم پہ مسکراتا ہے
ابر آتا ہے بھاگ جاتا ہے

لوگ سیلاب سے پریشاں ہیں
اور ہم گرمیوں سے نالاں ہیں

یہ مقدر کا خوب چکر ہے
یعنی سب کا الگ مقدر ہے

بس اب اے شاعرِ سیاست بس
بس یہ افسانۂ مصیبت بس

ختم کر اس دعا پہ اپنا کلام
لائے سرما کو گردشِ ایام

فارغ البال خاص و عام ہیں
اور سردی سے شادکام ہیں

یا الٰہی بہ فیضِ حسنِ سخن
بند کر دے شاعروں کا چلن

۴ر اکتوبر ۱۹۵۹ء

○

جب سے دشمن کے گھر کو دیکھا ہے
ہر بلا میرے گھر نہیں آتی

جب کوئی خواب دیکھ لیتا ہوں
نیند دو دو پہر نہیں آتی

کتنے شیریں ہیں تیرے لب اے دوست
چائے میں اب شکر نہیں آتی

۱۰ر اکتوبر ۱۹۵۹ء

گاہے گاہے ہی سہی صورتِ دلدار بھی دیکھ

O

ہم نے جب شاعر سیاست سے اس "انگریزی ہٹاؤ سمیلن" کا ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس خوشی کا ہلکا سا عکس ان اشعار میں دیکھ سکتے ہیں ؎

میرے قریب بھی ہرگز نہ لاؤ انگریزی
میری زبان نہیں ہے، ہٹاؤ انگریزی

کوئی مرے تو کرو اہتمام قوالی
مگر برات میں باجا بجاؤ انگریزی

بڑھاؤ از سرِ نو اتحاد قوموں کا
کہ تور مے تو ہو چینی، پلاؤ انگریزی

تمھیں غرض ہے نہ اردو سے اور نہ ہندی سے
پیو "نشر یخ" شب و روز کھاؤ انگریزی

رہو جو گھر میں تو باگیسری سے شوق کرو
کلب میں جاؤ تو گانا سناؤ انگریزی

جناب شیخ جب انگلش میں بات کرتے ہیں
تو میرے سینے پہ لگتے ہیں گھاؤ انگریزی

عجیب حال ہے اس وقت میرے ملک کا بھی
کوئی یہ چیخ رہا ہے، ہٹاؤ انگریزی

کسی کو ضد کہ یہ فرصت بہت غنیمت ہے
جو چل سکے تو ابد تک چلاؤ انگریزی

۸ر اکتوبر ۱۹۵۹ء

○

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گذر گئے
دروازۂ چمن سے جو گذرے وہ مر گئے

لیلیٰ کے بعد طبقۂ نسواں خموش ہے
مجنوں کے بعد مرد بڑا نام کر گئے

اب مدرسوں میں دیکھئے تعلیم کا عروج
استاد پوچھتا ہے کہ لڑکے کدھر گئے

راکٹ چلا تھا چاند کی جانب خدا گواہ
لیکن کچھ اہل ذوق خلا میں اتر گئے

۱۵ر اکتوبر ۱۹۵۹ء

○

کہا لڑکے سے والد نے شفیق و مہرباں ہو کر
نجابت بھی ضروری ہے مگر سائنسداں ہو کر

جنھیں تنقید کا شکوہ ہے کوئی ان کو سمجھائے
شکر نے تلخ کامی کو بڑھایا ہے گراں ہو کر

محلہ بھر میں جنکی رزم آرائی کا شہرہ ہے
وہ اپنے گھر میں بیوی سے بھی ڈرتے ہیں میاں ہو کر

۱۸ر اکتوبر ۱۹۵۹ء

○

کمالِ حسن کا اچھا صلہ دیا تم نے
جو مس نہیں ہے اسے مس بنا دیا تم نے

ملے جو مجھ سے تو خود اپنا حال بھول گئے
مجھی کو میرا فسانہ سنا دیا تم نے

تمام دہر میں بجلی کی روشنی کر دی
مگر چراغِ محبت بجھا دیا تم نے

○

ہوا ہے یہاں قحط جب سے شکر کا
بہت تلخ ہے کاروبارِ محبت
سنا ہے یہ ہم نے پروفیسروں سے
گدھے بھی اٹھاتے ہیں بارِ محبت
مری چشمِ گریاں کو دیکھا تو بولے
یہی ہے یہی آبشارِ محبت

۲۰ اکتوبر ۱۹۵۹ء

○

جگر جب سے نہیں اس انجمن میں
نہ دل بستی میں لگتا ہے نہ بن میں
کہا غسال سے مرنے نے ہنس کر
کہ بوتل بھی رکھ دینا کفن میں
کوئی بلبل نہ صحرا میں ملے گی
کوئی اُلّو نہ پاؤ گے چمن میں
شکار آمادہ ہے قدرت بھی شاید
تبھی تو گوشت رکھا ہے ہرن میں
یہاں غلہ کبھی سستا نہ ہوگا
تو جو چاہے سمجھ لے اپنے من میں
جسے چاہیں اُسے تھپڑ لگا دیں
کہاں سے آگئی قوت بدن میں

۱۳ نومبر ۱۹۵۹ء

○

ناصر کاظمی کا کیا خوب مطلع ہے۔

آنکھ پہروں نم رہی دل خوں ہوا
تب کہیں اک شعر تر موزوں ہوا

اس زمین میں شاعرِ سیاست نے ارتجالاً یوں کہا ہے۔

شعر گوئی ہے، کہ ہے دردِ جگر
سچ بتا تیرا یہ عالم کیوں ہوا!
ایک بچہ تھا بہت ہی ہونہار
عشقِ لیلیٰ میں وہی مجنوں ہوا
کیا قیامت ہے اثر آواز کا
نغمہ جاں بخش چرخ چوں ہوا

O

چند اشعار ملاحظہ ہو۔

نقاب روئے روشن کو اُٹھا کر وہ یہ کہتے ہیں
اندھیرا ہی اگر رہتا تو پروانے کہاں جاتے

نہیں رندوں کی محفل یہ تو ملاؤں کا جلسہ ہے
اگر داڑھی نہ رکھتے ہم تو پہچانے کہاں جاتے

وہ ٹکڑوں میں رہتے ہیں ہمیں جن سے محبت ہے
ذرا سی بات تھی ہم ان کو سمجھانے کہاں جاتے

عرض کیا ہے،

چائے پینے کا مزا جاتا رہا
ملک میں جب سے شکر کم ہو گئی

یہ گرانی اور یہ بارش الاماں
رفتہ رفتہ زندگی نم ہو گئی

مل گئی جواری کی روٹی بھوک میں
اور وہی مرغِ مسلّم ہو گئی

شیخ جی سمجھے مقامِ انکسار
جب بڑھاپے میں کمر خم ہو گئی

قیس کی آہیں پیامِ عقد تھیں
سن کے لیلیٰ اور برہم ہو گئی

ایک مصرعہ طرح پر شاعرِ سیاست نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔

مفلسی میں پیٹ کے بھرنے کی صورت ہو گئی
لیگ آخر سرمۂ چشمِ بصیرت ہو گئی

فارغ البالی سے کٹتی ہے حیاتِ مختصر
لیڈری کے شوق میں پوری حجامت ہو گئی

آندھرا پردیش کو گمراہ کرنے کے لیے
نام پلی میں نمایاں اک جماعت ہو گئی
وہ یہ کہتے تھے کہ ہم زندہ کریں گے قوم کو
دیکھتے کیا ہیں کہ خود اپنی ہلاکت ہو گئی

۱۱ر نومبر ۱۹۶۹ء

O

آپ نے داغ کی وہ مشہور غزل ضرور سنی ہو گی جس کا مطلع ہے ؂
شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری
اس پر شاعر سیاست کے افکار تازہ ملاحظہ ہوں۔

دیکھ برسات کے موسم میں یہ حالت میری
چھت ٹپکتی ہے تو ڈرتی ہے طبیعت میری
اس نے حجام کو دربان بنا رکھا تھا
ہو گئی یار کے کوچے میں حجامت میری
یہ نہ سمجھے مجھے کنجوس سمجھنے والے
میری اولاد کے کام آئے گی دولت میری
عمر بھر راہِ محبت میں رہا سرگشتہ
کسی فٹ پاتھ پہ رکھ دیجیے میت میری

○

کریم نگر میں ایک مشاعرہ ہونے والا ہے جس کے لئے حسب ذیل مصرعہ طرح دیا گیا۔

"بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے"

ہم نے یہ مصرعہ شاعر سیاست تک پہونچانا اپنا فرض سمجھا اور ہماری فرض شناسی کا نتیجہ یہ نکلا:

اکھاڑے میں اترے جواں کیسے کیسے
اچھالے گئے پہلواں کیسے کیسے

ولیمہ کی دعوت کا عالم نہ پوچھو
ہیں مرغِ مسلّم یہاں کیسے کیسے

ہمارے محلہ کی حالت بھی دیکھو
زمیں پر پڑے ہیں مکاں کیسے کیسے

کوئی صیغہ دار اور کوئی صرف شاعر
چُنے بیویوں نے میاں کیسے کیسے

مؤنث کو کہتے تھے اکثر مذکر!
تھے دلّی میں اہلِ زباں کیسے کیسے

اسے آپ چاہیں تو گرگٹ سمجھ لیں
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

○

چاہئے بھی چارہ گر نہیں ملتی | لاکھ ڈھونڈھو شکر نہیں ملتی
ہم نے اقدام خودکشی بھی کیا | موت کی رہگذر نہیں ملتی
عشق میں ہے یہ ضعف بینائی | حسن سے بھی نظر نہیں ملتی
مفت ملتی تھی پہلے دل کی دوا | اب نہ لائے چارہ گر نہیں ملتی

○

پاکستانی شاعر باقی صدیقی کا ایک شعر ہے۔

"حیرت ہے ان کے سامنے سے | غیروں کی طرح گذر گئے ہم"

جب یہ شعر شاعر سیاست کو سنایا گیا تو وہ یوں گویا ہوئے ؎

غم ہائے جہاں سے ڈر گئے ہم | اور اتنے ڈرے کہ مر گئے ہم
کیا چیز ہے دوستو خنجر | گلشن کی طرح سنور گئے ہم
مکتب سے اٹھے تھے دل گرفتہ | دفتر میں بہ چشم تر گئے ہم
بازار میں جب ملے نہ چاول | روتے ہوئے اپنے گھر گئے ہم
مچھلی نے نگل گیا جو ہم کو | ظاہر ہے کہ پار اتر گئے ہم

○

کس کو خبر تھی اتنی محبت کروں گا میں
دل کی ٹرک پہ لوڈ مصیبت کروں گا میں
ڈنڈے جفا کے خوب چلیں دھوم دھام سے
شکوہ کروں گا اور نہ شکایت کروں گا میں

تم ہو گئے جو اب کے الکشن میں کامیاب
پھر کچھ نہ پوچھو کس قدر عزت کروں گا میں
کہتے ہیں شیخ جی مجھے ہر دم جسلی کٹی
اکدن پکڑ کے خوب مرمت کروں گا میں

○

آپ اٹھ کر میری بزم سے کیا گئے
شمع گل ہو گئی پھول مرجھا گئے

مجھ سے بچھڑے مری روح پر چھا گئے
آپ تو دور جا کر قریب آ گئے

عشق میں ہار جانا بڑی جیت ہے
یاں تو جو کھو گئے وہ ہی پا گئے

لب پہ موج تبسم مگر آنکھ نم
وہ محبت کا مفہوم سمجھا گئے -

آج بھی زندگی میں وہی درد ہے
کل کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ آ گئے

کاش وہ دیکھ لیتے مرے اشک غم
جو ستارے چمکتے ہی بجھوا گئے

زندگی عشق بن کے چمکنے لگی!!
کس اندھیرے میں ہم ان سے ٹکرا گئے

کس کی باتیں ذہن میں مرے گونج اٹھیں
کس کے نغمے مرے لب پہ لہرا گئے

پھر پڑی دل میں شائد امید سکوں
پھر مسلسل تڑپنے کے دن آ گئے

○

ہرچند تھی مشاہدہ حق کی گفتگو
تھا رہ سکا نہ بادہ و ساغر کہے بغیر

دہرا نہ دینا شعر کہ بہرہ نہیں ہوں میں
سنتا ہوں لاکھ ایک بات مکرر کہے بغیر

○

سمجھا یہ رازِ عشق بھلا چارہ گر کہاں
جاتا ہے "ایسپرو" سے میرا دردِ سر کہاں
تھیں اِن کی والدہ بھی نمائش میں ساتھ ساتھ
اُٹھی تھی ان کے واسطے پہونچی نظر کہاں
لڑتے ہیں اہلِ ذوق وزارت کے واسطے
اب زن کہاں، زمین کہاں، اور زر کہاں

۳ر جنوری ۱۹۶۱ء

○

غالب اور شاعر سیاست،

کوئی دن گر زندگانی اور ہے	اپنا کھانا اور پانی اور ہے
پہلے بھی ہوتا تھا ہم کو دردِ سر	پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
آگ کپڑوں میں لگی ہے غم نہ کر	سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
اور رہے ان کا ارادہ آج کل	ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

۱۰ر جنوری ۱۹۶۱ء

○

شاعر سیاست کے قلم سے ایک مختصر آزاد نظم "درد اور دوا"

میں نے جب اُن سے کہا درد ہے میرے دل میں
ہنس کر فرمانے لگے
جاؤ کہیں بہرِ علاج
دردِ دل کے لئے عناب کا رس پیتے ہیں

عرق گاؤزبان بھی ہے بہت اس میں مفید
اس کی قوت کو پہونچتا ہی نہیں شربت دید

اس کو جو شوق سے پیتے ہیں وہی جیتے ہیں
ورنہ پھر جا کے دواخانہ میں داخل ہو جاؤ

آخری منزلِ عشاق یہی ہوتی ہے

پوچھتا ہوں ارے میرے خداوند کریم
کیا کرے کوئی جو محبوب بن جائے حکیم

۱۰ر جنوری ۱۹۶۱ء

O

تا تھیا کرتے آنا

چھپ چھپ کے گلی سے آنا — آ کے دِل میرا چرانا
چوری کا مال بچانا — منھ بنگا کر کے چڑانا

تا تھیا کرتے آنا

تارے گنتا بیٹھوں گا — چاول چنتا بیٹھوں گا
آہٹ سنتا بیٹھوں گا — آ کر ایک دھول جمانا

تا تھیا کرتے آنا

راتوں میں چوری چوری — آیا کر میری گوری
کندھے پر دل کی بوری — تم ہی یہ بوجھ اٹھانا

تا تھیا کرتے آنا

○

مزے تو لیتے ہیں پھر بھی یہ کہتے جاتے ہیں
نئے اچار بناؤ کہ چاشنی کم ہے

لوازمات سب ہی ہیں مگر ندیدہ ہے وہ
کہے گا کہ آج تو دستر پہ فیرنی کم ہے

دوا سے ہو کہ دعا سے ہو کام بن جائے
مریض دمہ کا کہتا ہے دھونکنی کم ہے

یہ باغِ عام کے مالی نے شعر سن کے کہا
قفس میں شعر بھی رکھو کہ شیرنی کم ہے

○

فلمی گیت "نیند چرانے والا آگیا" کا حشر ملاحظہ کیجیے لیکن ذرا بچکے۔

خوش تھے کہ دیکھا بھالا آگیا
ہاتھ بٹانے والا آگیا
پیر ہیں لیکن چھالا آگیا
گورا گیا تو کالا آگیا
نیند چرانے والا آگیا

خواب میں سوئے منزل میں چلا
کون کرے گا یہ ہمت بھلا
بھتنی ملی جنگل میں نہ بلا

راہ میں لیکن نالہ آ گیا
نیند چرانے والا آ گیا

گھورا کیا میں اس کو رات بھر
فاصلہ تھا مجھ سے اک ہاتھ بھر
کچھ نہ پایا پھر بھی گھات بھر

آنکھ میں ایسا جالا آ گیا
نیند چرانے والا آ گیا

○

جب مٹھائی سے معمور چپا ہوا
دل میرا بھول کر گول گپا ہوا

آ گیا دل کی جب واپسی کا سوال
ہاتھا پائی ہوئی۔ دھول دھپہ ہوا

فلمی دنیا کی تعریف ہے بس یہی
نغمہ جا کر جہاں لاڑی لپا ہوا

شاعری کا نرالا یہ انداز ہے
میرا ہر شعر لفظوں کا کپا ہوا

باد صرصر چلی اس ادا سے جناب
نامہ اڑ کے مرا خود ہی ٹپہ ہوا

جو صاحب ان اشعار کا معنی بتائیں گے انھیں معقول انعام دیا جائے گا۔

بیخودی غرضِ مدعا کیا ہے
زندگی ہے ہوا، ہوا کیا ہے

نقشِ آہن گری ہے وجہ ملال
سوزشِ ترکِ ماسوا کیا ہے

بے نیازی بہ رنگ پارینہ
حسنِ الطافِ التجا کیا ہے

آرزو پرتوِ کمالِ حیات
بے دلی ہائے کبریا کیا ہے

O

آج کل ایک خاص قسم کی نظم چل پڑی ہے نمونہ ملاحظہ ہو ۔

رات ہوئی ہے

سو جانے دو
صبح کو اُٹھکر

گھر جائیں گے

مرغی انڈا
انڈا مرغی

شام بہاراں
دال ۔ روٹی

صبح قیامت

اللہ اللہ

ساون آیا

بھادوں لایا

نرم پھواریں
بلبل کوکی

کوئل بولی

ریچھ کا بچہ

اے غم جاناں

اے غم دوراں

دھوم مچاؤ

بینگن کھاؤ

عشق بلا ہے

حُسن روا ہے

گڑبڑ جھالا

سوزِ تمنا

بھاگ یہاں سے

اُلّو کے پٹھے

۱۷ جنوری ۱۹۶۱ء

○

جو بچپن میں جاہ و حشم دیکھتے ہیں
وہ بچے جواں ہو کے کم دیکھتے ہیں

یہی ہے ہماری نگاہوں کا مقصد
ستم دیکھتے ہیں کرم دیکھتے ہیں

جو کرتے تھے امن کی گفتگو میں
ہم آج ان کی مٹھی میں بم دیکھتے ہیں

۳۱ جنوری ۱۹۶۱ء

○

ایک مصرعہ طرح پر شاعر سیاست نے کہا ہے:

آئے تھے پہلے رُخ کی تجلّی لئے ہوئے
اب آرہے ہیں ہاتھ میں لاٹھی لئے ہوئے

شیرینیٔ سخن کا بھرم آج کھل گیا
کرتے ہیں بات منہ میں جلیبی لئے ہوئے

شوہر کا حال دیکھ کے بیوی اداس ہے
منڈی سے گھر میں آئے ہیں گوبھی لئے ہوئے

۲ فروری ۱۹۶۱ء

ایک مشاعرے کے لئے طرح دی گئی ہے۔
"کارواں سوئے منزل رواں ہوگیا"

اس پر شاعرِ سیاست نے یوں کہا ہے۔

کیا خوشی اب جو وہ مہرباں ہوگیا
سن رہے ہیں کہ غلہ گراں ہوگیا
مِل کے رہنا کسی کا مقدر نہ تھا
وہ چینی ہوگئے میں چناں ہوگیا
اُن کی ہر آرزو سب پہ ظاہر ہوئی
اور میرا مدعا چیتاں ہوگیا

۱۷ر فروری ۱۹۶۱ء

O

ایک فلمی گیت ہے!
یہاں تو ہر چیز بکتی ہے! کہو جی تم کیا کیا خریدو گے؟
جواباً یہ اشعار ملاحظہ ہوں

کبھی ہم مارکٹ جائیں گے اور میدہ خریدیں گے
کبھی جا کر کسی دوکان سے کپڑا خریدیں گے
نظر آئیں گے جس دن آسماں پر ابر کے ٹکڑے
تو بنڈی روک کر رستے میں اک بھٹا خریدیں گے
ہمارے واسطے قایم ہے منڈی سیرِ عالم کی
جگر شکل سے ملتا ہے تو امباڑا خریدیں گے

کسی ہوٹل میں پیالی چائے کی پیش نظر رکھ کر
طبیعت موج پر آئی تو اک کپا خریدیں گے
مگر یہ جانتے ہیں، اِس گرانی کے زمانے میں
کہ ہم جو کچھ خریدیں گے بہت مہنگا خریدیں گے

O

کسی محترمہ کی ایک غزل شائع ہوئی ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

غم و آلام سے دوچار ہوئی جاتی ہے
زندگی ہجر میں دشوار ہوئی جاتی ہے

اِس پر شاعرِ سیاست نے جو طبع آزمائی کی ہے آسے درج کیا جاتا ہے۔

کشتیٔ عشق ابھی پار ہوئی جاتی ہے
موج میرے لیے منجدھار ہوئی جاتی ہے
انقلاباتِ محبت کو نہ سمجھا کوئی
زندگی خیر سے جبار ہوئی جاتی ہے
گھر میں بنتی ہے جو ملتی نہیں دکانوں پر
قوم ہر حال میں سرشار ہوئی جاتی ہے
جسم تو روح سے بیزار نہیں ہے اپنا
روح کیوں جسم سے بیزار ہوئی جاتی ہے
ایک مزدور یہ کہتا تھا مشینوں کی صدا
کسی پازیب کی جھنکار ہوئی جاتی ہے

○

شکیل بدایونی کی ایک غزل چھپی ہے جس کا مطلع ہے سے

اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا
جانے کیوں آج تیرے نام پہ رونا آیا

اس زمین میں شاعر سیاست نے بھی طبع آزمائی کی ہے سے ۔

صبح کو آنکھ کھلی شام پر رونا آیا
کام کرنے کو چلے کام پر رونا آیا

دور سے ہم نے شریفوں پہ بہائے آنسو
آم کی فصل میں ہر آم پر رونا آیا

جب دواخانے میں معجون مفرح نہ ملی
اے طبیبو مجھے سر سام پہ رونا آیا

میں نے بچپن میں سنایا جو الف بے کا سبق
میم سے پہلے مجھے "لام" پہ رونا آیا

فارغ البال تھے طفلی میں تو ہنستے تھے بہت
جب بڑے ہو گئے حجام پہ رونا آیا

۱۷ر نومبر ۱۹۵۹ء

○

شاعری جب حقیقت سے ٹکرا گئی
صرف مطلع کہا تھا کہ نیند آ گئی

چند حسینوں کی خاطر وہ کہنے لگے
بزم پہ آپ ہی کی غزل چھا گئی

دل کی چوری ہوئی یار نے کا غبن
عشق کو جو ادا بھا گئی بھا گئی

دررہِ وحشت میں یہ حال ہے عقل کا
جیسے مچھلی کسی جال میں آ گئی

۲۵ر نومبر ۱۹۵۹ء

○

ایک خبر کا عنوان ہے
"چور اُلٹا کوتوال کو ڈانٹے"
شاعرِ سیاست نے جب غور کیا تو اس جملہ میں وزن پایا اور جب وزن پایا تو یوں کہا ؎

چور اُلٹا کوتوال کو ڈانٹے — سوداگر دلال کو ڈانٹے
طاری ہو جب وجد کا عالم — ہر سامع قوال کو ڈانٹے
پہلے اپنا ہاتھ دِکھائے — پھر فوراً رمال کو ڈانٹے
آئے نہ جب تلوار چلانا — زخمی ہو کر ڈھال کو ڈانٹے
شیر کو کھو کر دشمن اپنا — خالی خولی کھال کو ڈانٹے
پھنس جاتا ہے قسمت اسکی — مچھلی کیونکر جال کو ڈانٹے
چپراسی کو ڈانٹ رہے ہیں — جیسے کوئی کنگال کو ڈانٹے
بوجھ رکھے بازار میں اس پر — گھر جا کر حمال کو ڈانٹے
وقت ہے ایک طفلِ مکتب — نشتر لکھے اقبال کو ڈانٹے

○

کہیں اور بھاگ جاؤ مجھے نیند آ رہی ہے
میرے پاس اب نہ آؤ مجھے نیند آ رہی ہے
مجھے راگ سے حسد ہے مجھے راگنی سے نفرت
کوئی بھیرویں سناؤ مجھے نیند آ رہی ہے

وہ ہے بے نیازِ مستی، اسے سن کے چونک اٹھونگا
مرا گیت اب نہ گاؤ، مجھے نیند آرہی ہے
میں ہوں پیٹ کا پجاری میں ہوں شاعری کا دشمن
کوئی شعر گنگناؤ، مجھے نیند آرہی ہے

O

نئی دہلی میں آسٹریلیا اور ہندوستان کے درمیان کرکٹ کا ٹسٹ میچ شروع ہو چکا ہے لہذا آج اس کالم میں ایک نظم درج کی جاتی ہے جس کا عنوان ہے۔

کرکٹ نامہ

الٰہی تو کھیلوں کا مختار ہے
تیرے ہاتھ میں جیت اور ہار ہے
تیرے فیض سے گیند اور بلے کی شان
ترے لطف سے ہر کھلاڑی جواں
وہ آوٹ ہوا تجھ سے جو پھر گیا
ذرا منہ جو پھیرا وکٹ گر گیا
ترا فضل گر شاملِ حال ہے
خلا میں معلق ہے جو "بال" ہے
ہمارے کھلاڑی ہیں میدان میں
نہ آئے خلل ان کے ایمان میں

جو ہے رامچندر ان میں کپتان ہے
بہت چاق چوبند، بلوان ہے

ہے جوشی بھی ایک نوجوانِ وطن
یقیں ہے کہ یہ بھی بنائے گا رن

نمایاں ہے اس ٹیم میں رائے بھی
کوئی جا کے اس کو یہ سمجھائے بھی

کہ اے مرد دانا و چالاک و چست
تو رکھ رات دن اپنی صحت درست

ہمارا کھلاڑی ہے عباس بھی
مقام اس کا ہے دور بھی پاس بھی

غرض ٹیم اپنی بھی کچھ کم نہیں
اگر ہار جائے، کوئی غم نہیں

کہ یہ زندگی خود ہی ایک کھیل ہے
جدھر دیکھئے اک دھکا پیل ہے

مگر پھر بھی یارب ہے تجھ سے دعا
کرم کر ہمیں ہارنے سے بچا

ہمارے کھلاڑی وہ بلّے گھمائیں
مخالف ڈریں اور سر اپنا بچائیں

بناتے رہیں یہ سدا رن پہ رن
دکھاتے رہیں مستقل فن پہ فن

ڈسمبر ۱۹۵۹ء

شیشہ و تیشہ

(شاہد صدیقی کے مزاحیہ کالم)

پبلیشر: آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی - حیدرآباد